جلد ۶ عدد ۴
ربیع الآخر ۱۳۵۴ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)
رجسٹر نمبر ایم (۲۹۵)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (عہ)

قیمت فی پرچہ ۸/

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابو الاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی نہیں بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت غیر مجلد (للعہ) سکہ انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ۵ سکہ انگریزی ۱۲ سکہ عثمانیہ!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ۔ جلد (۶) عدد (۴)

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۴۲
مقالات:-		
عبادت	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۵۳
قصۂ حضرت یوسف علیہ السلام	جناب ابو اللیث شیر محمد صاحب ندوی	۲۶۸
تنزیل و تاویل:-		
تفسیر سورۃ الناس	جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی	۲۸۰
حاملان قرآن:-		
شیخ خیرالدین عمادی	جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی	۲۸۷
رسائل و مسائل:-		
تعلیمات قرآن کے متعلق بحث	ابوالاعلیٰ مودودی	۲۹۴
تقریظ و انتقاد:-		
امہات الامۃ	ابوالاعلیٰ مودودی	۳۰۹
مطبوعات:-	ا۔م	۳۱۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جس طرح عداوتوں میں سب سے زیادہ خطرناک عداوت وہ ہے جو دوستی کے پیرایہ میں کی جائے اسی طرح ضلالتوں میں سب سے زیادہ خطرناک ضلالت وہ ہے جو ہدایت کے لباس میں پیش ہو۔ آپ کھلے دشمن سے زک اٹھا سکتے ہیں، مگر دھوکا نہیں کھا سکتے۔ یہ ممکن ہے کہ علانیہ آپ کے مقابلہ میں آکر وہ آپ کی جان، مال اور عزت کو نقصان پہنچا دے، مگر یہ ممکن نہیں کہ آپ اس کو دوست سمجھ کر اس کے شر سے مطمئن ہو کر اپنی جان، مال اور عزت اس کے سپرد کر دیں، اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیں۔ اسی طرح کھلی ہوئی گمراہی آپ کے عقیدے اور عمل کو فاسد کر سکتی ہے۔ مگر کبھی آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں کر سکتی کہ آپ راہ راست پر گامزن ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک صریح ضلالت کی ظاہری زینت کو دیکھ کر آپ اُسے ضلالت جانتے ہوئے اختیار کر لیں۔ مگر ایسی ضلالت سے یہ خطرہ تو نہیں کہ آپ اسے عین ہدایت اور سراسر خیر و صلاح سمجھیں گے، اس کے شر سے امون ہو کر اپنے عقائد اور اعمال پر اس کو مسلط کر لیں گے، اور بر سر فساد ہونے کے باوجود اس دھوکے میں پڑ جائیں گے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔

پس جس طرح دوست نما دشمن تمام دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے، اسی طرح تمام گمراہ کرنے والوں سے زیادہ خطرناک وہ گمراہ کرنے والا ہے جو ہادی کے لباس میں جلوہ گر ہو، اور داعی حق بن کر باطل کی طرف دعوت دے۔

ایک شخص آپ کے سامنے علانیہ اسلام کی مخالفت کرتا ہے، قرآن پر حملے کرتا ہے، ذات رسالت مآب پر اعتراض کرتا ہے، اسلامی عقائد کے خلاف دلائل پیش کرتا ہے، اسلامی عبادات اور فرائض دینی کو مہمل ٹھیراتا ہے، اور قوانین شرعی کا ابطال کرنے میں اپنا زور بیان صرف کر دیتا ہے۔ یہ کھلا ہوا دشمن ہے۔ صریح ضلالت کی طرف دعوت دینے والا ہے۔ اگر آپ مسلمان ہیں اور مسلمان رہنے کا آپکا عزم پختہ ہے، تو اس دشمن سے آپ کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ اس لیے کہ آپ کو صاف طور پر معلوم ہے کہ یہ دشمن اسلام ہے، کفر کی طرف بلا رہا ہے۔ لیکن اگر آپ کا ایمان ضعیف ہے تو بڑے سے بڑا خطرہ جو اس کی تبلیغ کفر سے ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ آپ کو اسلام سے پھیر دے گا۔ یہ خوف تو اس سے نہیں کہ وہ آپ کو اسلام سے منحرف کر کے، آپ کے عقائد و اعمال خراب کر کے بھی آپ کو اس فریب میں ڈال دے گا کہ آپ مسلمان ہیں، اور اصلی اسلام وہی ہے جس کی تعلیم وہ آپ کو دے رہا ہے۔

ایک دوسرا شخص مسند ارشاد پر بیٹھ کر قرآن کا وعظ کہتا ہے، آیات الٰہی کی تفسیر بیان کرتا ہے، ایمان و عمل صالح کی طرف دعوت دیتا ہے، عبادات میں خلوص کی تلقین کرتا ہے، اور جب اس تقریر سے آپ کے دل میں اپنے ہادی برحق اور داعی الی الخیر ہونے کا نقش اچھی طرح بٹھا چکتا ہے، تب آپ سے کہتا ہے کہ نماز پانچ وقت کی نہیں صرف تین وقت کی ہے، روزے پورے ماہ رمضان کے نہیں صرف تین دن یا حد سے حد دس دن کے ہیں، زکوٰۃ کے لیے کوئی مقرر نصاب نہیں ہے تمہاری مرضی پر ہے کہ جتنا چاہے خیرات کرو۔ غرض اسی طرح وہ دل کھول کر اسلام کے ارکان ایک ایک کی قطع و برید کرتا چلا جاتا ہے، اور ہر ہر قدم پر آپ کو یقین دلاتا ہے کہ یہی قرآن کی تعلیم ہے، یہی خدا کا حکم ہے، یہی رسول کا اسوۂ حسنہ ہے۔ کیا یہ چھپا ہوا دشمن جو ہدایت کے لباس میں گمراہ

کرنے والا، اس کھلے ہوئے دشمن ایمان سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک نہیں؟ وہ تو آپ پر علانیہ حملہ کر رہا تھا۔ آپ اس کے حملے سے باخبر تھے، آپ کے لیے موقع تھا کہ اس سے اپنے ایمان کو بچائے جائیں مگر اس چھپے ہوئے دشمن سے آپ کیوں کر بچیں گے جو دوست بن کر آپ کو مٹھائی میں زہر دے رہا ہے، ہلاکت کی طرف یہ فریب دیکھیے جا رہا ہے کہ درحقیقت وہ ہلاکت نہیں عین سلامتی ہے۔

یوپی کے ایک مسلمان گریجویٹ صاحب جو اس سے پہلے اشاعت اسلام کی خاطر سور کا گوشت حلال کرنے کی تجویز پیش کر چکے ہیں، آجکل انھوں نے "مواعظ قرآن" کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے، اور ان "مواعظ" کی اشاعت کا شرف امرت سر کے رسالہ "بلاغ" کو حاصل ہو رہا ہے جو اُمت مُسلمہ کا ماہوار صحیفہ" ہے، اور ہر مہینہ اپنے ان مقاصد کا اعلان کرتا رہتا ہے: "قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت۔ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ سے صراط مستقیم کی طرف دعوت۔ اصل اسلام پر اعتراضات کے جوابات اور غلط فہمیوں کا ازالہ"۔ اس وقت اس سلسلہ کا تیسرا "وعظ" ہمارے پیش نظر ہے جس میں فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ کی تفسیر ارشاد ہوئی ہے۔ واعظ اپنا وعظ اس طرح شروع کرتا ہے کہ آیت میں تمام آنے والی مسلمان نسلوں کے لیے تنبیہ ہے کہ:-

> "خبردار ایسا نہ کرنا کہ نماز کے معنی بس یہ سمجھ لینا کہ چاہے دل لگے یا نہ لگے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کیسا ہی بے محل کیوں نہ ہو، مصلّی بچھا کر چار ٹکریں ماریں اور منہ سے کچھ بڑبڑا دیا۔ ایسی نماز سے بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ وہ صرف دکھانے کے لیے پڑھی جاتی ہے اور عند اللہ مکروہ بلکہ مغضوب ہے"۔ ......

> "نماز کو بچوں کا کھیل مت سمجھنا۔ اس کے ادا کرنے میں بڑی ذمہ داری ہے کیونکہ وہ درحقیقت خدا اور اس کے فرشتوں کی حضوری اور شہادت کا وقت ہوتا ہے۔

تو کیا تمہاری بے دلی کی نماز اس کو منہ چڑھانا نہ ہوگا۔ نماز میں خدائے واحد و قدوس کے جلال و بزرگی و کبریائی کا اعتراف ہوتا ہے۔ تم اس کے حضور میں ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہو۔ بھلا سوچو تو یہ کتنی بڑی گستاخی ہوگی کہ ایسے بڑے دربار میں حاضر ہو کر تم ایسی حرکتیں کرو کہ اگر کسی دنیاوی امیر کے سامنے کرو تو تم کو فوراً دربار سے نکال باہر کر دے۔ تم پر حیف و صد حیف ہے کہ اپنی نماز میں الٹا خدا کا غضب مول لو۔ لہٰذا نماز کے لیے چار ضروری شرطیں ہیں مشاغل دنیاوی سے یکسوئی جسم لباس کی طہارت۔ الفاظ قرآن کو سمجھنا اور باایمان ہونا"

دیکھیے قرآن کا وعظ ہے۔ "قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرنے والے رسالہ میں شایع ہو رہا ہے" "حق گو" کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ تمہید ایسی ہے کہ جو مسلمان پڑھے گا یقین لے آئے گا کہ واعظ کا مقصود خلوص فی العبادہ کی تلقین کرنا ہے۔ یہ سب باتیں جمع ہو کر ایک سیدھے سادے مسلمان کو واعظ کی طرف سے بالکل مطمئن کر دیتی ہیں، اور اس کے دل میں کوئی خوف اس امر کا باقی نہیں رہتا کہ اس کے وعظ میں کوئی چیز اس کو گمراہ کرنے والی بھی ہوگی۔ اس طرح جب وہ ضلالت کے تمام خطرات سے مامون ہو جاتا ہے، تو اسی مرشدانہ انداز میں اس سے کہا جاتا ہے۔

"دیکھو دنیا کے بہترین اوقات فطرۃً ہمیشہ وہی ہوتے ہیں جب کہ آدمی سو کر اٹھتا ہے یا جب سونے کے لیے تیار ہوتا ہے اور جب وہ اپنے گھر کام سے فارغ ہو کر سر شام لوٹتا ہے۔ اس کے علاوہ جو اوقات بھی نماز کے ہوں گے وہ دنیاوی مصروفیت یا آرام و سیر و تفریح کے ہوتے ہیں۔ ایسے اوقات میں نماز میں یکسوئی پیدا کرنا ذرا مشکل ہے، ورنہ ایسے وقتوں میں نماز پڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ان

وقتوں میں یکسوئی حاصل کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان اوقات میں نماز ادا کرتے ہیں۔ وہ نہایت سراسیمگی اور بددلی سے :

اس کے بعد سامع کو وعظ کی ایک اور خوراک دی جاتی ہے، تاکہ وہ اس دعوت ضلالت سے منحرف نہ ہو جائے :

"حرکات جسمانی کا مقصد نماز نہیں، وہ اظہار خشوع و خضوع کے ساتھ یکسوئی پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اصل نماز تمہاری تقدیس و تکبیر و تحمید و تلاوت قرآن پاک ہے جس کے لیے تمہارے دماغ اور دل کا مستعد اور یکسو ہونا شرط ہے"

یہ دوسری خوراک ہضم کر کے جب سیدھا سادہ مسلمان دوبارہ گمراہی کے خطرے سے بے خوف ہو جاتا ہے تو زہر کا یہ آخری جرعہ اس کے حلق کے نیچے اتارا جاتا ہے :-

"میرے فہم ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ اس کا اشارہ (یعنی وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ کا اشارہ) اُن فتووں سے ہے جن کی کوئی سند قرآن میں نہیں ہے، لیکن وہ قرآن کے احکام سے بڑھ کر ہمارے لیے معمول بہ ہیں، اور ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ خلاف فطرت اوقات میں ہم سے نماز پڑھوائی جاتی ہے، جن میں نہ ہم تہ دل سے نماز میں رجوع ہو سکتے اور نہ اپنے مفاد زندگی کے لیے کوئی کام کر سکتے ہیں :"

اس تمام وعظ کا اصل مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ظہر اور مغرب کی نماز کا وقت اڑا دیا جائے، کیونکہ ظہر کی نماز کے لیے انگریزی حکومت اور انگریزی کمپنیوں نے اپنے مسلمان ملازموں کے لیے کوئی وقت دینا پسند نہیں کیا ہے، اور مغرب کی نماز کا وقت بدقسمتی سے وہی ہے جو سینما کا ہے، کلب کی تفریحات کا ہے، ٹینس بلیرڈ اور برج کھیلنے کا ہے۔ اس وقت کھیل چھوڑ کر نماز پڑھنا ہمارے

صاحب لوگوں کو ناگوار ہوتا ہے۔ اس مقصد کو خود "واعظ" صاحب ہی نے کھول کر رکھ دیا ہے:-

"میرے بعض دوست ایسے ہیں جو ماشاءاللہ بڑے پابند نماز ہیں میں نے ان کو دیکھا ہے کہ شام کو ٹینس اور برج کھیلتے کھیلتے وہ دفعتہً نماز پڑھنے لگ گئے یا کسی پارٹی میں کھاتے کھاتے اٹھ کھڑے ہوئے اور جھٹ نماز پڑھ ڈالی۔ یا اجلاس میں مقدمہ کی سماعت کر رہے ہیں کہ یکایک گھڑی نے ان کو ظہر کی نماز یاد دلا دی اٹھ کھڑے ہوئے اور عادۃً نماز کے ارکان چبوترے پر ادا کر ڈالے۔ میں کبھی اس قسم کی نمازوں کو نماز ہی شمار نہیں کرتا اور ہمیشہ قرآن کی یہ آیت یاد کر کے میں کانپ جاتا ہوں"۔

دشمنان اسلام کی ایک قسم وہ تھی جنہوں نے دفتروں کے اوقات میں مسلمانوں کو نماز کے لیے چھٹی دینے سے انکار کیا، اور اس معاملہ میں ان پر سختیاں کیں مسلمان ان دشمنوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور انھوں نے کیا۔ جو سچے مسلمان تھے انھوں نے حکم خدا اور رسول کے مقابلہ میں کسی جابر کے حکم کی پروا نہ کی حتیٰ کہ بہتوں نے نماز کی خاطر اپنے روزگار تک سے ہاتھ دھو لیا، اور جو ضعیف الایمان تھے، انہوں نے اگرچہ روزگار کی خاطر نماز ترک کر دی، مگر پھر بھی دل میں اپنی اس کمزوری پر شرمسار رہے۔ ایک دوسری قسم دشمنوں کی وہ تھی جنھوں نے نماز کے خلاف علانیہ تبلیغ کی، اس کو فضول اور لغو کہا، مسلمانوں کو اس سے منحرف کرنے کے لیے طرح طرح کی تحریصوں کے جال بچھائے۔ مسلمان ان دشمنوں کا مقابلہ بھی کر سکتے تھے، اور انہوں نے کیا۔ اس لیے کہ یہ کھلے دشمن تھے، ان کے شر سے بچ جانا آسان تھا۔ لیکن اس دشمن کے شر سے بچنا کس قدر مشکل ہے جو انہی دشمنوں کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جبر اور مخالفانہ تبلیغ کے ذرائع کو چھوڑ کر نصیحت اور وعظ کا ذریعہ

اختیار کرتا ہے، قرآن کو آلہ کار بناتا ہے، اور مسلمانوں کو یقین دلاتا ہے کہ ظہر اور مغرب کی نماز تو خدا نے تم پر فرض ہی نہیں کی، ان نمازوں کا پھندا تو دراصل ان جاہل ملانوں نے تمہارے گلے میں ڈال دیا ہے جو نَمعُونَ الماعون کے مصداق ہیں، ان ظالموں نے بالکل "خلاف فطرت اوقات" تجویز کر کے تم کو نمازوں میں لگا دیا، اور اس کا انجام یہ ہوا کہ تم سے دفتروں کی ملازمتیں چھوٹیں، دنیا کے کاروبار چھوٹے، کلب اور سینما چھوٹے، غرض ترقی کی تمام راہوں سے تم الگ ہو گئے، قرآن نے ہرگز ایسی نماز کا حکم نہیں دیا، وہ تو صرف تین وقت کی نماز تم سے پڑھوانا چاہتا ہے اور وہ بھی اس "ضروری شرط" کے ساتھ کہ "مشاغل دنیوی سے یکسوئی ہو"۔ یہ وہ دشمنی ہے جو دوستی کے پیرایہ میں کی گئی ہے۔ وہ ضلالت ہے جس کو ہدایت کا نہایت خوشنما لباس پہنایا گیا ہے۔ جو کام کھلے دشمن نہ کر سکے، علانیہ گمراہ کرنے والے نہ کر سکے، اس کو انجام دینے کے لیے اب دوست نما دشمن اور مدعی اصلاح مفسد اٹھے ہیں۔ اب سادہ لوح مسلمان کے دین و ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے!۔

بادی النظر میں تو یہ حملہ صرف اوقات نماز ہی پر ہے لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بڑے خطرے کی ابتدا ہے۔ مسلمانوں کو پنجوقتہ نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب قریب اُسی تواتر کے ساتھ پہنچی ہے جس کے ساتھ قرآن پہنچا ہے۔ جس طرح قرآن کی صحت پر ہمارا یقین و اذعان محض اس بنا پر ہے کہ اس کتاب کو ہزاروں آدمیوں نے حضورؐ سے سنا اور پھر لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے صحابہ سے سنا اور ان کے بعد ہر گذرنے والی نسل سے آنے والی نسل کو قرآن انہی الفاظ کے ساتھ پہنچتا رہا اسی طرح پنجوقتہ نماز کی فرضیت پر یقین کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس اس سے زیادہ مضبوط اور محکم کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ہزاروں آدمیوں نے آنحضرت صلعم سے صلوٰۃ الخمس کا حکم سنا اور آپ کے اقتداء میں اس پر سالہا سال تک عمل کیا، ان کے بعد نسلاً بعد نسل کروڑہا کروڑ مسلمان یہی سنتے اور دیکھتے اور عمل کرتے چلے آئے ہیں کہ اسلام پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ اور مسلمانوں میں ہر قسم کی فرقہ بندیوں کے باوجود کبھی صلوٰۃ الخمس کی فرضیت کے بارے میں اختلاف نہیں ہوا۔ اس تواتر،

سے جو یقین نماز کے معاملہ میں حاصل ہوتا ہے وہ اگر کسی شک ڈالنے والے کے شک ڈالنے سے متزلزل ہو جائے تو پھر اُس یقین کو متزلزل کر دینا بھی کچھ مشکل نہیں جو قرآن مجید کے متعلق اسی تواتر سے حاصل ہوا ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ایسی متواتر خبر بھی شک و شبہہ کی زد میں آسکتی ہے تو ایک شخص اس امر میں بھی شک کر سکتا ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع مبعوث بھی ہوئے تھے یا نہیں اس لیے کہ جس تواتر کے ساتھ ہم کو آنحضرت سے پنجوقتہ نماز پہنچی ہے اسی تواتر کے ساتھ آنحضرت کے مبعوث ہونے کی خبر بھی پہنچی ہے اگر شک کی بیماری ہمارے دل پر اس قدر غالب ہو جائے کہ آج ہم پنجوقتہ نماز کے فرض ہونے میں شبہ کرنے لگیں تو کچھ عجب نہیں کہ کل یہی بیماری ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق بھی شک میں ڈال دے۔

باطل کی طرف دعوت دینے والوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنی دعوت ضلالت کے تمام مقاصد کو بیک وقت بے نقاب نہیں کرتے بلکہ سب سے پہلے دین کے مسلمات و یقینیات میں سے کسی ایک چیز پر حملہ کر کے اپنی پوری قوت صرف اسی کو متزلزل کرنے میں صرف کر ڈالتے ہیں۔ یہ ایک گہری نفسیاتی چال ہے۔ اگر وہ سب کچھ ابتدا ہی میں کھول دیں تو شاید کوئی مسلمان بھی ان کے جال میں نہ پھنسے اس لیے وہ اپنے کام کی ابتدا شکوک و شبہات کی تخم ریزی اور یقینیات میں سے کسی ایک امر یقینی کی بنیاد ڈھانے سے کرتے ہیں۔ جو لوگ اس پہلے حملہ کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ جاتے ہیں ان کا دین و ایمان تو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے لیکن جو کمزور طبیعت کے لوگ اس حملہ کی تاب نہیں لا سکتے وہ پہلے مورچہ پر شکست کھانے کے بعد ایسے مغلوب ہوتے ہیں کہ گمراہ کرنے والا ان کے یقینیات میں سے ایک ایک کو مسمار کرتا چلا جاتا ہے، اور وہ گمراہی کی آخری منزل تک اس کی پیروی کیے چلے جاتے ہیں کیونکہ جب کسی شخص کے دل میں شک کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے، اور یقین کی قوت پر شک کا مادّہ غالب آجاتا ہے تو پھر شکوک کے سیلاب میں اس کے پاؤں ایسے اکھڑ جاتے

ہیں کہ وہ بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور کہیں اس کے قدم جمنے نہیں پاتے۔ ایک امر یقینی کا انکار در اصل اسی ایک امر کے انکار پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسان کے نفس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ ویسے ہی دوسرے یقینیات کا بھی انکار کر دے اس لیے کہ تمام یقینیات کی بنیاد ایک ہی ہوتی ہے جب وہ بنیاد کسی ایک امر میں متزلزل ہو جاتی ہے تو دوسرے تمام یقینی امور بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور اس وقت یہ بات بالکل داعی ضلالت کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے کہ اپنے تتبع سے جس چیز کا چاہے انکار کرا لے۔ اسلام میں جتنے فرق باطلہ پیدا ہوئے ہیں ان سب کے بانیوں نے اسی طریقہ سے کامیابی حاصل کی ہے۔ قادیانی تحریک کی روشن مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بانی نے بھی سب سے پہلے اسلام کے ایک یقینی مسئلہ (یعنی ختم نبوت) کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شکوک ڈالنے شروع کیے تھے۔ جو لوگ اس پہلے حملہ سے بچ گئے وہ تو ہمیشہ کے لیے بچ گئے۔ مگر جن کے یقین کی بنیاد اس مسئلے میں متزلزل ہو گئی وہ گمراہی کی دعوت سے ایسے مغلوب ہوئے کہ مرزا صاحب نے جس جس چیز کا چاہا ان سے انکار کرا لیا، اور جو چیز اسلامی تعلیمات کے خلاف پیش کی اس کا اقرار ان سے کرا کے چھوڑا۔

جناب مقبول احمد صاحب المعروف "بہ حق گو" جس مذہب کی بنیاد اٹھا رہے ہیں اس کے تمام خط و خال ہم کو ان کی کتاب "مطالعہ حدیث" میں نظر آ گئے ہیں۔ اس کی حقیقت تو انشاء اللہ ہم عنقریب اس کتاب کی تنقید میں کھول دیں گے لیکن اس وقت ہم جریدۂ بلاغ کے ناشرین سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت" کا یہ کونسا شعبہ ہے جس کا افتتاح آپ نے کیا ہے؟ کیا قرآن کی تعلیم وہی ہے جس کو سلسلہ مواعظ قرآن میں پیش کیا گیا ہے؟ کیا آپ نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی؟

أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ (۱۷:۹) نماز قائم کرو آفتاب ڈھلنے کے وقت۔

اس آیت میں آفتاب ڈھلنے کے وقت سے مراد ظہر کے سوا اور کونسا وقت ہو سکتا ہے؟ اور

کیا آپ نے قرآن میں یہ بھی نہیں پڑھا؟

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ (۱۱:۱۰)۔ — نماز قائم کر دن کے دونوں کناروں پر اور تھوڑی رات گذرنے کے بعد۔

یہاں زُلَفًا مِّنَ اللَّیل (یعنی عشا) کے وقت سے علٰحدہ، اور دن کے ایک کنارے (یعنی فجر) کے مقابل جس دوسرے کنارے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مغرب کے سوا اور کونسا وقت ہو سکتا ہے! پھر کیا یہ آیت بھی قرآن میں آپ کو نہیں ملی؟

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِھَا وَمِنْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّھَارِ (۲۰:۸) — اور تسبیح کر اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے وقتوں میں پھر تسبیح کر، اور دن کے کناروں پر۔

کیا اس آیت میں چار علٰحدہ علٰحدہ اوقات کی تصریح نہیں ہے؟ قبل طلوع شمس اور دن کے کناروں میں سے ایک کنارا تو ظاہر ہے کہ صبح کا وقت ہے قبل غروب سے مراد عصر ہے۔ اناءِ اللیل سے مراد عشاء ہے ان تین وقتوں کے علاوہ دن کے دوسرے کنارے سے مراد اگر مغرب کا وقت نہیں تو کیا ہے؟ پھر یہ آیت بھی تو قرآن میں تھی۔ آپ نے اس کو کیوں نہ دیکھا؟

فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْھِرُوْنَ۔ (۳۰:۲) — اللہ کی تسبیح کرو جب تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو آسمان و زمین میں اسی کے لیے حمد ہے۔ اور اس کی تسبیح کرو سہ پہر کو اور جب تم پر دوپہر کا وقت آئے۔

کیا اس آیت میں حِیْنَ تُمْسُوْنَ سے مراد مغرب کے سوا کوئی اور وقت ہے؟ اور کیا عَشِیًّا (سہ پہر یا عصر) سے علٰحدہ حِیْنَ تُظْھِرُوْنَ سے ظہر کے سوا کوئی دوسرا وقت مراد ہو سکتا ہے؟ اگر یہ آیات قرآن ہی کی ہیں، اور ان سے نماز کے پورے پانچ وقت ثابت ہوتے ہیں تو کیا اس وعظ کو

قرآنی وعظ کہا جا سکتا ہے جس میں مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ نماز صرف تین وقت کی ہے، اور ظہر و مغرب کی نماز کا حکم قرآن میں نہیں ہے؛ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی دشمنی میں آپ حضرات کا غلو اس حد تک بڑھتا جا رہا ہے کہ اب آپ قرآن کے دشمنوں سے بھی محض اس لیے اتحاد کر سکتے ہیں کہ وہ حدیث کی دشمنی میں آپ سے متفق ہیں۔

سلسلۂ کلام طویل ہو گیا اس لیے یہاں اس شبہہ کا ازالہ نہیں کیا جا سکتا جو "حق گو" صاحب نے نماز کے لیے "دنیاوی مشاغل سے یکسوئی" کی قید لگا کر پیدا کیا ہے۔ انشاء اللہ اشاعت آیندہ میں اس کی تحقیق کی جائے گی۔

مقالات

عبادت

"یہ مضمون صفر اور ربیع الاول ۱۳۵۱ھ کے "معارف" میں شائع ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ اس کو ترجمان القرآن میں شایع کیا جاتا ہے۔"

انسان کے مذہبی تصورات میں عبادت کا تصور سب سے پہلا اور اہم تصور ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مذہب کا بنیادی تصور عبادت ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک نوع انسانی کے جتنے مذاہب کا پتہ چلا ہے، عام اس سے کہ وہ انتہا درجہ کی وحشی اقوام کے اوہام ہوں، یا اعلیٰ درجہ کی متمدن اقوام کے پاکیزہ معتقدات، ان میں سے ایک بھی عبادت کے تخیل و تصور سے خالی نہیں۔ آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو کے سلسلہ میں پرانی سے پرانی قوموں کے جو نشانات ملے ہیں وہ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ گو وہ قومیں عقل و شعور کے بالکل ابتدائی درجہ میں تھیں لیکن اس حالت میں بھی انھوں نے اپنی بساط بھر کسی نہ کسی معبود کو ضرور ڈھونڈا ہے، اور کوئی نہ کوئی طریق عبادت ضرور اختیار کیا ہے۔ قدیم قوموں کو جانے دیجئے۔ آج بھی بہت سی انسانی جماعتیں زمین کے مختلف گوشوں میں موجود ہیں جو عقلی و ذہنی اعتبار سے اپنی نوع کے ابتدائی ادوار کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ان کے حالات کا مطالعہ کرنے والوں نے گواہی دی ہے کہ ان میں مشکل ہی سے کوئی ایسی جماعت دیکھی گئی ہے جو عبادت کے تصور سے کلیۃً خالی ہو۔ پس یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان قدیم ترین وحشت و بداوت سے لیکر جدید ترین تہذیب و حضارت تک جتنے مدارج سے گذرا ہے ان میں سے ہر درجہ میں عبادت کا تصور اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے،

گو اس کے مظاہر اور اشکال میں بے شمار تغیرات و اختلافات رونما ہوئے ہیں۔

غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ یہ خیال سارے بنی آدم پر حاوی ہے اور تمام زمانوں میں باوجود اختلافِ احوال یکساں حاوی رہا ہے؟ کیا یہ بالارادہ اختیار کیا گیا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو ساری نوع پر اس کا اس طرح حاوی ہو جانا غیر ممکن تھا۔ کیونکہ بالارادہ اختیار کی ہوی چیزوں میں کبھی کامل اتفاق نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا۔ انسان کی اختیار کی ہوی چیزوں میں سے ایک بھی ایسی نہ ملے گی جس کے اندر ہر مرتبہ اور ہر دور کی تمام انسانی جماعتیں یکساں شترک ہوں۔ اور یہ کسی طرح متصور نہیں ہے کہ ہر زمانہ کے آدمیوں نے ایک عالمگیر کانفرنس کر کے باہم یہ طے کر لیا ہو کہ وہ کسی نہ کسی کی عبادت ضرور کریں گے، خواہ معبود مختلف اور طریقہائے عبادت بے شمار ہوں۔ پھر جب یہ چیز اختیاری نہیں ہو سکتی تو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ عبادت کا جذبہ انسان کے اندر ایک فطری جذبہ ہے[1] جس طرح انسان کو بھوک فطری طور پر لگتی ہے اور اس کو فرو کرنے کے لیے وہ غذا تلاش کرتا ہے جس طرح اسے سردی اور گرمی فطری طور پر محسوس ہوتی ہے اور اس سے بچنے کے لیے وہ سایہ اور لباس ڈھونڈتا ہے، جس طرح ادائے مافی الضمیر کی خواہش اس میں فطری طور پر پیدا ہوتی ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے وہ الفاظ و اشارات بہم پہنچاتا ہے بالکل اسی طرح عبادت کا جذبہ بھی انسان میں فطرۃً پیدا ہوتا ہے، اور اس کی تسکین کے لیے وہ کسی معبود کو تلاش کرتا اور اس کی بندگی کرتا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم بھوک، اور سردی و گرمی کے احساس اور ادائے

[1] معترض کہہ سکتا ہے کہ ایسے افراد بکثرت پائے جاتے ہیں، اور ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں اور تقریباً ہر زمانہ میں موجود رہی ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں اور جو عملاً و اعتقاداً کسی کی عبادت نہیں کرتیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح مخنثوں کی ایک کثیر جماعت کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ جذبۂ شہوت ایک فطری جذبہ نہیں ہے، اور جس طرح مجردوں اور راہبوں کے ایک بڑے گروہ کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ ازدواج کی خواہش ایک فطری خواہش نہیں ہے، اسی طرح ایسے افراد یا جماعتوں کا موجود ہونا بھی، جن کے اندر مخصوص اسباب کے تحت عبادت کا فطری جذبہ مردہ یا بے حس ہو چکا ہے، اس دعوے کی دلیل نہیں بن سکتا کہ انسان میں عبادت کا جذبہ ایک فطری جذبہ نہیں ہے

مانی الضمیر کی خواہش کے معاملہ میں دیکھتے ہیں، فطرت کا اثر زیادہ تر اس مجرد داعیہ کی حد تک رہتا ہے جو انسان کو غذا، سایہ، لباس اور وسیلۂ اظہار مافی الضمیر کی تلاش پر مجبور کرتا اور جسم کے ان اعضا کو جو ان کاموں سے متعلق ہیں حرکت دینے پر ابھارتا ہے، اور اسی حد تک تمام انسانوں میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے آگے فطرت کا اثر کمزور اور خود انسان کا اپنا اختیار غالب ہو جاتا ہے، اور یہیں سے وہ بے شمار اختلافات شروع ہوتے ہیں جو غذا، مکان، لباس، زبان اور اشارات و علامات کی مختلف صورتوں اور حیثیتوں کے اعتبار سے ہر زمانہ کی مختلف قوموں میں پائے گئے ہیں۔ قریب قریب یہی حال عبادت کے فطری جذبہ کا بھی ہے کہ وہ انسان کو بندگی و پرستش پر اُکسا کر چھوڑ دیتا ہے، اور اس کے بعد یہ خود انسان کا اپنا کام ہوتا ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے کوئی معبود تلاش کرے اور اس کی عبادت کا کوئی طریقہ نکالے۔ اسی اختیار کی حد پر پہنچ کر معبودوں اور عبادت کے طریقوں میں وہ اختلاف شروع ہوتا ہے جو انسان کی اختیار کی ہوئی تمام چیزوں میں نظر آتا ہے گو اس معاملہ میں بھی فطرت کی رہنمائی انسان کا ساتھ بالکل نہیں چھوڑتی جس طرح غذا اور لباس وغیرہ فطری مطلوبات کے انتخاب میں نہیں چھوڑتی ہے لیکن یہ رہنمائی اتنی دھندلی اور خفی ہوتی ہے کہ اس کا ادراک کرنے کے لیے نہایت لطیف و نازک شعور کی ضرورت ہے جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

آئیے اب ہم سراغ لگائیں کہ اس فطری داعیہ کا سررشتہ کہاں سے ملتا ہے؟ اس کشش کا مرکز کہاں ہے جو انسان کو عبادت کے لیے کھینچتی ہے؟ کونسی قوتیں ہیں جو اسے معبود کی تلاش اور اس کی عبادت پر ابھارتی ہیں؟ اور وہ کیا رہنمائی ہے جو اس تلاش میں ہم کو خود فطرت سے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے لیے ہم کو سب سے پہلے خود عبادت کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے بغیر ان سوالات کا حل مشکل ہے۔

عبادت کا تصور دراصل ایک جامع تصور ہے جو دو ذیلی تصورات کے امتزاج سے مکمل ہوتا ہے۔ ایک بندگی، دوسرے پرستش۔ بندگی کے معنی ہیں کسی بالاتر قوت کی بڑائی تسلیم کرکے اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کرنا۔ اور پرستش کے معنی ہیں کسی بالاتر ہستی کو پاک، مقدس اور بزرگ سمجھ کر اس کے آگے سرِ نیاز

جھکا دینا اور اسے پوجنا۔ ان میں سے پہلا تصور عبادت کا ابتدائی اور بنیادی تصور ہے۔ اور دوسرا تصور انتہائی اور تکمیلی۔ پہلا زمین کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا عمارت کی۔ اس لیے ہمیں اپنی تحقیق کی ابتدا پہلے تصور سے کرنی چاہیے۔

بندگی یا فرمانبرداری و اطاعت ہمیشہ اس قوت کے مقابلہ میں کی جاتی ہے جو بندگی کرنے والے پر قہر و غلبہ اور قدرت و استیلا رکھتی ہو، اور بندے یا مطیع میں اُس کے حکم سے سرتابی کا یارا نہ ہو۔ اس کی ایک محدود شکل تو وہ ہے جو آقا اور نوکر کے درمیان ہم عموماً دیکھتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ وسیع تصور کے لیے سب سے زیادہ واضح مثال وہ بندگی ہے جو رعایا اپنی حکومت کی کرتی ہے۔ حکومت کوئی مادی شئے نہیں، نہ محسوس و مشاہد چیز ہے۔ ایک نظام و ضابطہ کی بندش ہے جس کا غلبہ و استیلا لاکھوں کروڑوں آدمیوں پر حاوی ہوتا ہے۔ رعایا اس کے قانون پر طوعاً و کرھاً چلتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں، کسان اپنے کھیتوں میں اور مسافر دور دراز جنگلوں میں، جہاں بظاہر حکومت کا زور جتانے والی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی، اس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کے حدود اختیار میں رہ کر جو شخص اس کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے اور زیادہ شدید نافرمانی کی صورت میں اس کے تمام وہ حقوق سلب ہو جاتے ہیں جو رعیت ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل تھے۔ اس لحاظ سے جس قدر لوگ کسی حکومت کے حدود میں رہتے ہیں اور اس کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں ان کے متعلق ہم کہا کرتے ہیں کہ وہ فلاں حکومت کی فرمانبرداری و اطاعت کر رہے ہیں، اور اگر ہم ان الفاظ کی جگہ مذہبی اصطلاح استعمال کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی بندگی و عبادت کر رہے ہیں۔

اب اس تصور کو اور زیادہ وسیع کیجئے۔ پوری کائنات پر نظر ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سارا عالم اور اس کا ایک ایک ذرہ ایک زبردست نظام میں جکڑا ہوا ہے، اور ایک قانون ہے جس پر خاک کے ایک ذرہ سے لے کر آفتاب عالمتاب تک ساری کائنات طوعاً و کرھاً عمل کر رہی ہے۔ کسی شئے کی یہ

مجال نہیں کہ اس قانون کے خلاف چل سکے، اور جو چیز اس سے ذرہ برابر سرتابی کرتی ہے وہ فساد اور فنا کی شکار ہو جاتی ہے۔ یہ زبردست قانون جو انسان، حیوان، درخت، پتھر، ہوا، پانی، اجسام ارضی اور اجرام فلکی سب پر یکساں حاوی ہے، ہماری زبان میں قانون فطرت یا قانون قدرت کہلاتا ہے۔ اس کے ماتحت جو کام جس چیز کے سپرد کر دیا گیا ہے وہ اس کے کرنے میں مشغول ہے۔ ہوائیں اس کے اشارے پر چلتی ہیں، بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے، پانی اس کے فرمان سے بہتا ہے، سیارے اس کے ارشاد سے حرکت کرتے ہیں، غرض اس تمام کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی قانون کے ماتحت ہو رہا ہے، اور ہر ہر ذرہ اسی کام میں لگا ہوا ہے جس پر اس قانون نے اسے لگا دیا ہے۔ جس چیز کو ہم زندگی، بقا اور کون کہتے ہیں وہ دراصل نتیجہ ہے اسی قانون کی اطاعت کا۔ اور جس چیز کو ہم موت، فنا اور فساد کہتے ہیں وہ حقیقۃً نتیجہ ہے اس قانون کی خلاف ورزی کا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر شئے جو زندہ اور باقی ہے وہ اس قانون کی اطاعت کر رہی ہے، اور کائنات عالم میں کوئی شئے زندہ اور باقی رہ نہیں سکتی اگر وہ اس کی اطاعت نہ کرے۔

لیکن جس طرح حکومت کی مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ قانون کی اطاعت دراصل قانون کی اطاعت نہیں، اُس حکومت کی اطاعت ہے جس نے اپنے قہر و غلبہ سے اس قانون کو نافذ کیا ہے، اور حکومت کا نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے لامحالہ ایک حاکم، ایک مرکزی فرمانروا، ایک مقتدر اعلیٰ ہستی کا وجود ضروری ہے، بالکل اسی طرح قانون فطرت کی اطاعت بھی دراصل اُس قاہر و غالب حکومت کی اطاعت ہے جو اس قانون کو بنانے اور زور و قوت سے اس کو چلانے والی ہے، اور یہ حکومت ایک فرمانروا کے دست قدرت میں ہے جس کے بغیر اتنا بڑا عالمگیر نظام ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔ یہاں اگر ہم قانونی لفظ "اطاعت" کو مذہبی اصطلاح "عبادت" سے بدل دیں اور لفظ "حاکم" کی جگہ "اللہ" یا "خدا" کا لفظ رکھ دیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساری کائنات اور اس کی ہر ہر چیز اللہ کی عبادت کر رہی ہے، اور یہ ایسی عبادت ہے جس

ہر شے کے وجود و بقا کا انحصار ہے۔ کائنات کی کوئی شئے اور مجموعی طور پر ساری کائنات اللہ کی عبادت سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہو سکتی، اور اگر غافل ہو جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی باقی نہیں رہ سکتی۔

قرآن مجید میں اس بندگی کو کہیں عبادت سے تعبیر کیا گیا ہے کہیں تسبیح و تقدیس سے کہیں سجود سے اور کہیں قنوت سے چنانچہ جگہ جگہ اس مضمون کی آیات آتی ہیں :—

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱:۳) میں نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ (۳۰ : ۳) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے سب اسی کے حکم کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (۲۱ : ۲) آسمانوں اور زمین میں جس قدر مخلوقات ہیں اور جو اس کے پاس ہیں سب اسی کے ہیں، وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں رات دن اس کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں اور کبھی اس سے کاہلی نہیں کرتے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۶۲ : ۱)۔ آسمانوں اور زمین میں جو چیز ہے اللہ ہی کی تسبیح کر رہی ہے وہ بادشاہ ہے پاک غالب، اور صاحب حکمت

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۲۴ : ۵) کیا تو نہیں دیکھتا کہ جس قدر مخلوق آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو پرندے پر پھیلائے اڑ رہے ہیں سب اللہ ہی کی تسبیح کر رہے ہیں۔ سب اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتے ہیں اور زمین و آسمان کی حکومت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب اسی کی

فِيهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷: ۵)

تسبیح کر رہے ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے گیت نہ گاتی ہو، مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (۵۵: ۱)

سورج اور چاند ایک حساب سے چکر لگا رہے ہیں اور درخت اور بوٹے سجدے میں ہیں۔

"کیا ان لوگوں نے خدا کی مخلوق میں کسی چیز کی طرف نظر نہیں کی جن کے سایے دائیں اور بائیں جھکتے ہیں، گویا اللہ کے آگے سربسجود ہیں، اور اظہار عجز کر رہے ہیں، اور جتنے جاندار اور ملائکہ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور اپنے رب سے جو بالاتر ہے ڈرتے ہیں اور جو ان کو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں" (۱۶: ۵)۔

"تو نہیں دیکھتا کہ جو مخلوق آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور چاند اور سورج اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے نیک آدمی اور بہت سے وہ بھی جو اپنی نافرمانی کی وجہ سے مستحق عذاب ہو چکے ہیں، سب کے سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں" (۲۲: ۲)

"زمین اور آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں سب طوعاً و کرہاً اللہ ہی کو سجدہ کر رہی ہیں" (۱۳/۲)

یہ عبادت، یہ سجود، یہ تسبیح، یہ قنوت تمام جاندار اور بے جان، ذی شعور اور بے شعور چیزوں پر یکساں حاوی ہے، اور انسان بھی اس پر اسی طرح مجبول ہے جس طرح مٹی کا ایک ذرہ، پانی کا ایک قطرہ اور گھاس کا ایک تنکا۔ انسان خواہ وہ خدا کا قائل ہو یا منکر، خدا کو سجدہ کرتا ہو یا پتھر کو، خدا کی پوجا کرتا ہو یا غیر خدا کی، جب تک وہ قانون فطرت پر چل رہا ہے، اور اس قانون کے تحت زندہ ہے، بغیر جانے بوجھے بلا عمد و اختیار، طوعاً و کرہاً خدا کی عبادت کر رہا ہے اسی کے سامنے سربسجود ہے اور اسی کی تسبیح میں لگا ہوا ہے اس کا چلنا پھرنا سونا جاگنا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب اسی کی عبادت ہے۔ چاہے وہ اپنے اختیار سے

کسی اور کی پوجا کر رہا ہو اور اپنی زبان سے کسی اور کی بندگی و اطاعت کا اقرار کر رہا ہو، مگر اس کا رونگٹا رونگٹا اسی خدا کی عبادت میں مشغول ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے، اس کا خون اُسی کی عبادت میں چکر لگا رہا ہے، اُس کا قلب اسی کی عبادت میں متحرک ہے، اس کے اعضاء اُسی کی عبادت میں کام کر رہے ہیں، اور خود اس کی وہ زبان جس سے وہ خدا کو جھٹلاتا اور غیروں کی حمد و ثنا کرتا ہے، اسی کی عبادت میں چل رہی ہے۔

اس عبادت کا صلہ یا اجر خدا کی طرف سے کیا ملتا ہے؟ فیضان وجود، رزق اور قوت بقاء جتنی چیزیں خدا کے قانون پر چلتی ہیں، اور اس کی بندگی کرتی ہیں، وہ زندہ اور باقی رہتی ہیں اور انہیں وہ وسیلۂ بقا عطا کیا جاتا ہے جسے ہم اپنی بولی میں "رزق" کہتے ہیں۔ اور جو چیزیں اس کے قانون سے انحراف کرتی ہیں ان پر فساد مسلط ہو جاتا ہے، اُن کا رزق بند ہو جاتا ہے، اور وہ فیضان وجود سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یہ معاملہ کائنات کی ہر چیز کے ساتھ ہو رہا ہے اور اس میں شجر و حجر، حیوان و انسان، کافر و شاکر کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا (۱۱: ۱)

کوئی چیز زمین پر چلنے والی ایسی نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور اللہ اس کے ٹھکانے اور سونپے جانے کی جگہ جانتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ۔ (۳۵: ۱)

اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو زمین اور آسمان سے تم کو رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا

وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے مطیع و مسخر بنا دیا

فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِّزْقِهِ ۖ
أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۷ : ۵)۔

پس تم اس کی پہنائیوں میں چلو پھرو اور اس کا رزق کھاؤ۔ کون ہے جو مخلوقات کو اول بار پیدا کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ، أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ۔ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَلْ لَجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ۔ (۶۷ : ۲)

کیا یہ لوگ پرندوں کو نہیں دیکھتے جو ان کے اوپر پر پھیلاتے اور سکیڑتے ہوئے اڑ رہے ہیں۔ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جو ان کو سنبھالے ہوئے ہو۔ وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ اور یہ رحمٰن کے سوا اور کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ مگر کافر ہیں کہ توہم میں پڑے ہوئے ہیں اور اگر اللہ اپنا رزق بند کر دے تو کون ہے جو تم کو رزق دے سکتا ہے؟ مگر یہ کافر سرکشی اور بے تابی پر جمے ہوئے ہیں۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح انسان اس بندگی میں دوسری اشیاء کے ساتھ مساوی ہے، اسی طرح اس کے اجر و معاوضہ میں بھی وہ مساوی رکھا گیا ہے۔ انعام کی صورتوں کا فرق جو کچھ بھی ہے، دراصل استعداد اور حاجتوں کے فرق پر مبنی ہے لیکن صورتوں سے قطع نظر کر کے اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایک درخت، ایک جانور، ایک چڑیا، ایک گھانس کی پتی کی احتیاج و استعداد کے مطابق اللہ اس کی دیکھ بھال، خبرگیری، امداد و اعانت، اور رزق رسانی کر رہا ہے، اسی طرح انسان کی احتیاج و استعداد کے مطابق اس پر بھی انعام فرماتا ہے۔ اس بارے میں انسان کو ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوقات کے مقابلہ میں اگر کوئی فضیلت ہے تو وہ محض صورت انعام کے اعتبار سے ہے

نہ کہ حقیقت انعام کے اعتبار سے۔ اور صورت انعام کا حال یہ ہے کہ وہ ہر شے کی طبیعت اور حاجت کے عین مناسب ہے۔ ایک چوہے پر جو انعام فرمایا گیا ہے، انعام کی وہی صورت اس کی فطرت اور ضرورت سے مناسبت رکھتی ہے۔ دوسری کوئی صورت جس کو ہم بہتر سمجھتے ہیں، اس کے لیے انعام نہیں بلکہ سزا ہو جائے گی۔ ایک بڑے سے بڑا منعم انسان جو آرام اپنی پھولوں کی سیج پر محسوس کرتا ہے، وہی آرام ایک چھوٹی سے چھوٹی چڑیا اپنے گھانس پھونس کے گھونسلے میں محسوس کرتی ہے۔ پھولوں کی سیج تنکوں کے گھونسلے پر لاکھ فخر کرے۔ مگر حقیقت میں گھونسلے والے کی استعداد کے مطابق اس کی احتیاج اسی طرح پوری کی گئی ہے جس طرح پھولوں کی سیج پر سونے والے کی استعداد کے مطابق اس کی احتیاج پوری کی گئی ہے۔ اس حیثیت سے دونوں پر خدا کا انعام یکساں ہے۔ پھر یہی معاملہ کافر و شاکر، مومن و مشرک کے ساتھ بھی یکساں ہے۔ جو لوگ خدا کے منکر ہیں اور اس کی پرستش نہیں کرتے، جو اس کے ساتھ اس کی مخلوق کو شریک کرتے ہیں، جو شجر و حجر کو اس کا مد مقابل ٹھیراتے ہیں، ان پر بھی رزق اور فیضانِ وجود اور حفاظت و خبرگیری کا انعام اسی طرح ہوتا ہے جس طرح سچے موحدوں اور خدا پرستوں پر ہوتا ہے بلکہ اگر قانون فطرت کی پیروی یا بالفاظ دیگر "فطری عبادت" میں ایک کافر ایک مومن سے بڑھا ہوا ہے، تو اس کی "عبادت" کا صلہ بھی کافر کو مومن سے بہتر صورت میں عطا ہوتا ہے خواہ وہ حقیقت بین نگاہ میں متاعِ غرور ہی کیوں نہ ہو۔

اب یہ سوال بآسانی حل ہو جاتا ہے کہ انسان میں عبادت کا جذبہ فطری طور پر کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اور وہ کیوں اپنے معبود کو تلاش کرتا ہے؟ جب ساری کائنات اور اس کی ہر چیز ایک غالب قاہر فرمانروا کی بندگی کر رہی ہے، اور خود انسان کا ایک ایک رونگٹا اس کی عبادت میں لگا ہوا ہے، اور وہ تمام عناصر جن سے انسان کا جسم مرکب ہے اس کے آگے سربسجود ہیں، اور جسم انسانی میں ان عناصر کی ترکیب اسی کے فرمان سے ہوئی ہے، اور انسان کا وجود ہر آن اس کی بندگی پر منحصر ہے، تو آپ سے آپ بندگی و عبودیت انسان کی سرشت میں داخل ہوگئی ہے۔ گو وہ اس حکومت کو نہیں دیکھتا جس کا وہ

بندہ ہے نہ دنیوی حکومتوں کی طرح اس خدائی حکومت کے عامل اور نمایندے اس کے سامنے آتے ہیں مگر چونکہ وہ بندہ ہی پیدا ہوا ہے، اور بلا ارادہ ہر وقت بندگی کر رہا ہے، اور اس کے مالک کی حکومت نے ہر طرف سے، اندر سے بھی اور باہر سے بھی، اس کو اور اس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں کو جکڑ رکھا ہے، اس لیے فطری طور پر اس کے اندر ایک نیازمندی، ایک نیایش و گرایش، ایک پرستش و عبودیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اس کا دل بے اختیار کسی معبود کو تلاش کرتا ہے کہ اس کی حمد و ثنا کرے، اس کی بڑائی بیان کرے اس کے آگے اپنی بندگی و عقیدت کی نذر پیش کرے، اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگے، اور ہر آفت سے اس کے دامن میں پناہ ڈھونڈے۔ یہی رشتہ ہے جس نے ابتدائے آفرینش سے انسان کو تلاش معبود پر مجبور کیا ہے اسی کی تحریک پر اس نے ہمیشہ پرستش کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی ہے اور یہی وہ عنصر ہے جس سے مذہب کی پیدائش ہوئی ہے

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، فطرت نے ہر معاملہ میں انسان کے اندر ایک جزء طلب ایک سادہ خواہش، ایک خالص کشش پیدا کر کے اس کو چھوڑ دیا ہے کہ اپنے مطلوب کو خود تلاش کرے گویا یوں سمجھیے کہ فطرت انسان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہے۔ ایک نامعلوم چیز کی طلب پر اکساتی ہے اور پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے، تاکہ وہ اپنی عقل پر زور دے کر اپنے حواس سے کام لے کر معلوم کرے کہ اس کے دل میں جس چیز کی لگن لگی ہوئی ہے، اس کی فطرت جو شئے مانگ رہی ہے، وہ کیا ہے اور کہاں ہے اور کس طرح اس کو حاصل کیا جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان کو مشکلات پیش آئی ہیں اور اسی نے اپنی عقلی استعداد، اپنی قوت فکر و تمیز کی رسائی اور اپنے ذوق و وجدان کی صلاحیت کے مطابق اپنے لیے وہ مختلف راستے نکالے ہیں جو آج نوع انسانی کے تمدن و معاشرت کی گوناگونی میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس تلاش و جستجو اور اختیار و انتخاب میں فطرت نے کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ مگر جس طرح وہ ہر ہر قدم پر حیوانات کی رہنمائی کرتی ہے، اس طرح انسان کی رہنمائی نہیں کرتی۔ انسان کو وہ نہایت لطیف اشاروں میں ہدایت دیتی ہے، نہایت خفیف روشنی دکھاتی ہے، جس کا ادراک معمولی عقل و بصیرت والے لوگ

نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ انسان کا اختیار تمیزی صحیح راستہ کی تلاش میں ناکام ہوا اور ہوائے نفس اس کو غلط راستوں پر بھٹکا لے گئی۔

مثال کے طور پر غذا کی خواہش پیدا کرنے سے فطرت کا منشا یہ تھا کہ انسان ایسا مواد اپنے جسم کو مہیا کرے جس سے وہ زندہ رہ سکے اور تحلیل شدہ اجزاء کا بدل اس کو ملتا رہے مگر بہت سے لوگ اس خوردن برائے زیستن کی حقیقت کو نہ سمجھے۔ تلاش غذا پر ابھارنے کے لیے جو ذائقہ کی چاشنی فطرت نے اس کے کام و دہن میں لگا دی تھی اسی کو وہ اصل مقصود سمجھ بیٹھے اور ہوائے نفس ان کو "زیستن برائے خوردن" کی غلط فہمی میں مبتلا کر کے فطرت کے اصل منشاء سے دور ہٹا لے گئی۔ اسی طرح لباس اور مکان کی طلب دراصل موسمی اثرات سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ مگر ہوائے نفس نے اس کو زینت و آرائش اور اظہار شان و ترفع کا ذریعہ بنا لیا، اور انسان فطرت کے منشاء سے تجاوز کر کے انواع و اقسام کے نفیس لباس اور عالیشان محل بنانے لگا جو آخر کار خود اسی کے لیے مضرت رساں ثابت ہوئے یہی حال ان تمام داعیات فطرت کا ہوا ہے جنھوں نے انسان میں مختلف چیزوں کی طلب پیدا کی، اور اس نے فطرت کے منشاء کو نہ سمجھ کر یا بسا اوقات سمجھنے کے باوجود نظر انداز کر کے، اپنے اختیار سے اس طلب کو پورا کرنے کے لیے وہ مختلف ڈھنگ اور طریقے نکال لیے جو فطرت کے اصل مقصد سے زائد اور بہت سے معاملات میں اس کے خلاف تھے۔ پھر یہی چیزیں اگلوں سے پچھلوں تک تمدن و تہذیب، رسم و رواج اور آداب و اطوار بن کر پہنچیں جن کی گرفت نے بعد کی انسانی نسلوں کو ایسا جکڑا کہ فطرت کی رہنمائی کو سمجھنا تو درکنار، ان کے لیے اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کرنے کی آزادی بھی باقی نہ رہی، اور اسلاف کے طریقوں نے مقدس قوانین بن کر ان کو اندھی تقلید کے رستے پر ڈال دیا۔ حالانکہ فطرت جس طرح پہلے انسان کو لطیف اشارے اور خفیف ہدایتیں دے رہی تھی اسی طرح آج بھی دے رہی ہے اور ہمیشہ دیتی رہیگی، جنھیں عقل سلیم تھوڑے یا بہت اجتہاد سے ہر وقت سمجھ سکتی ہے۔

تلاش معبود کی فطری خواہش کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا ہے۔ جب انسان نے عبادت کے جذبہ سے بےچین ہو کر اپنے لیے کسی معبود کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو فطرت اپنے اُسی لطیف انداز میں اس کو معبود حقیقی کے اتے پتے دینے لگی کہ تیرا معبود وہ ہے جس نے تجھے پیدا کیا ہے، جو تجھ سے بالاتر ہے، جس کی قوت کے سامنے تو عاجز ہے، جو ہر چیز پر غالب ہے، جو تجھے اور ہر جاندار کو روزی دیتا ہے، جو اپنے حسن و جمال اور خوبی و رعنائی کی بنا پر ہر طرح تیری مدح و ستایش کا مستحق ہے، جس کا نور آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو روشنی دیتا ہے، جس کا جمال اپنے جلوؤں سے آب و گل کی مورتوں کو یہ جوبن اور یہ نکھار اور یہ دل فریب حسن بخش دیتا ہے، جس کا جلال پانی کی موج، ہوا کے طوفان، زمین کی لرزش، پہاڑ کی سربلندی، شیر کی درندگی اور سانپ کی گزندگی میں اپنی شوکت کا اظہار کرتا ہے، جس کی ربوبیت ماں کے سینے میں محبت و شفقت بن کر، گائے کے تھن میں دودھ بن کر، درخت کی ٹہنی میں پھل بن کر، پتھر کے کلیجے میں پانی بن کر ظہور کرتی ہے۔ یہ لطیف اشارے ہر زمانے میں مختلف سمجھ بوجھ کے لوگوں کو دیے گئے، اور ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ان اشاروں سے اس پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کی۔

کسی نے ان صفات کے معبود کو زمین پر تلاش کیا اور پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، اور نفع و ضرر پہنچانے والے جانوروں پر فریفتہ ہو گیا، تنفسی اعضاء کو پوجنے لگا، آگ کے سامنے دھونی رما بیٹھا، ہوا کے آگے سربسجود ہوا، دھرتی ماتا کو عقیدت کا خراج دینے لگا۔ غرض اس کی نظر آس پاس ہی کے مظاہر میں اُلجھ کر رہ گئی۔

کسی کی نظر اس سے آگے بڑھی وہ ارضی معبودوں سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ یہ سب چیزیں تو اسی کی طرح کسی اور کی بندگی میں مبتلا ہیں، خود اپنے وجود و بقا کے لیے بھی غیر کی محتاج ہیں۔ ان کے پاس کیا رکھا ہے جس کے لیے ہم استعانت کا ہاتھ بڑھائیں اور عقیدت کی پیشانی جھکائیں۔ آخر اس نے زمین کو چھوڑ کر آسمان پر اپنے معبود کو تلاش کیا۔ سورج کو دیکھا، چاند پر نظر ڈالی، اجرام فلکیہ کی چمک دمک دیکھی اور کہا کہ

یہ ہیں عبادت کے لائق۔

مگر جو اس سے بھی زیادہ باریک بین تھا اس کو آسمان والوں کا حال بھی زمین والوں سے کچھ زیادہ بہتر نظر نہ آیا۔ اس نے کہا کہ یہ لاکھ بلند و برتر سہی، روشن اور روشن گر سہی، لیکن اپنے اختیار سے کیا کر سکتے ہیں؟ ایک مقررہ قانون، ایک لگے بندھے نظام کے تحت گردش کیے جا رہے ہیں۔ سورج کو اپنی ہمہ عظمت و بزرگی آج تک یہ مجال نہ ہوئی کہ مشرق کے بجائے کسی روز مغرب سے نکل آتا یا اپنے مقام سے ایک ہی انچ سرک جاتا۔ چاند کبھی اس قابل نہ ہوا کہ جو دن اس کے ہلال بننے کا تھا اس دن بدر بن کر نکلتا۔ اسی طرح کوئی اور سیارہ بھی اپنی مقررہ گردش سے کبھی یک سرمو تجاوز نہ کر سکا۔ اس بندگی، بے چارگی، کھلی ہوئی غلامی کو دیکھ کر اس جویائے معبود نے آسمان سے بھی منہ موڑ لیا، تمام مادی جسمانی چیزوں کو ناقابل پرستش قرار دیا اور اپنے معبود کی تلاش میں معانی مجردہ اور روحانیات کی طرف پیش قدمی کی۔ نور کا پروانہ بنا، دولت کی دیوی پر فریفتہ ہوا، محبت کے دیوتا پر ریجھا، حسن کی دیوی کا گرویدہ ہوا، قوت کے دیوتا کو سجدہ کیا، مدبرات عالم کے ہیکل تجویز کیے اور ان کی عبادت اختیار کی، ارواح اور عقول اور ملائکہ کو مسجود بنایا، اور سمجھا کہ یہی عبادت کے لائق ہیں۔

اسی طرح کائنات کی ہر وہ چیز جس کے اندر مختلف قابلیتوں کے لوگوں کو اپنی اپنی فکر کی رسائی اور نظر کی استعداد کے مطابق برتری، ربوبیت، قدرت، حسن، جلال اور خلاقیت کی جھلک نظر آئی، اس کے آگے جھک گئے اور فطرت کے دیے ہوئے سراغ پر جو شخص جتنی دور جا سکا گیا اور ٹھیر گیا۔ مگر جو لوگ زیادہ صحیح وجدان، زیادہ لطیف ادراک، اور زیادہ سلیم عقل رکھتے تھے، اور فطرت کے بتائے ہوئے نشانات پر ٹھیک ٹھیک سفر کرتے تھے، وہ ان ارضی و سماوی معبودوں اور روحانی و خیالی دیوتاؤں میں سے ایک سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔ بیچ کی منازل میں سے ایک پر بھی نہ ٹھیرے اور بڑھتے بڑھتے اس منزل تک پہنچ گئے جہاں انھیں کائنات کی تمام مادی، روحانی، ذہنی، علوی اور سفلی قوتیں کسی اور کی گرفت میں جکڑی ہوئی، کسی اور کی بندگی میں مشغول، کسی اور کے آگے جھکی ہوئی، کسی اور کی تسبیح پڑھتی ہوئی نظر آگئیں۔ یہاں انھوں نے اپنے دل کے کانوں سے یہ آواز سنی۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱ : ۲) میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم میری ہی عبادت کرو۔

یہ اسی معبود کی آواز تھی جس کی تلاش میں وہ چلے تھے مطلوب نے اپنا پتا آپ بتادیا۔ سفر ختم ہوگیا منزل مقصود مل گئی۔ اور ڈھونڈنے والے مطمئن ہوگئے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس آخری ہدایت کو پانے کے بعد پھر کوئی مزید تلاش و جستجو کے لیے بے چین نہ ہوا۔ بے چینی، بے قراری، بے اطمینانی جو کچھ بھی تھی تیجہ کی منزلوں ہی تک تھی۔ آخری منزل پہنچ کر ہر دل نے گواہی دی کہ جس کو ڈھونڈ رہے تھے وہ یہی ہے، اب کسی تلاش و جستجو کی حاجت نہیں۔ (باقی)

مرأۃ المثنوی

مرتبہ

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور اُن کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے۔ کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کیلئے ایسی سہولت مہیا کردی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کرسکتا ہے۔ کاغذ کتابت طباعت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت ۵ سکہ انگریزی لعہ سکہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے

قصۂ حضرت یوسف (علیہ السلام)

توریت اور قرآن کے بیانات کا موازنہ

از جناب ابو اللیث شبیر محمد صاحب ندوی

توریت ایک آسمانی کتاب ہے جس پر ایمان لانا، اسی طرح ضروری ہے، جس طرح قرآن پر۔ کتاب اللہ کے اندر متعدد آیتیں ہیں جن میں اگلی کتابوں کو بھی ماننا اسلام کا جزء قرار دیا گیا ہے؟ ایک جگہ خدا نے فرمایا ہے۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ۔ اگلے رسولوں کو جو آسمانی کتابیں دی گئی ہیں ان میں سے بعض کا نام اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے۔ انھیں میں سے توریت بھی ہے، جس کے متعلق تصریح ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کو عطا کی گئی تھی، اس لیے توریت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے لیکن توریت کے منزل من اللہ تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے موجودہ نسخوں کو بھی تسلیم کرلیں اور اس میں جو کچھ رطب و یابس ہے سب پر ایمان لائیں، کیونکہ عقلی و نقلی دلائل اور خود قرآن کی تصریح سے توریت اور انجیل کا محرف ہونا ثابت ہے اور اکثر غیر متعصب یہودی اور عیسائی علماء کو اس کا اعتراف ہے

اگرچہ علماء کا اختلاف ہے کہ بائبل میں تحریف لفظی ہوئی ہے یا معنوی، لیکن میرے نزدیک صحیح تر اور قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کی تحریفیں ہوئی ہیں لفظی بھی اور معنوی بھی جس طرح عیسائیوں نے ابن اور اب کے الفاظ کو جو اظہار شفقت کے موقع پر استعمال کیے گئے تھے، ان کے حقیقی معنوں پر محمول کر دیا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشینگوئیوں کو تاویل کرکے دوسرے قالب میں ڈھال دیا، اسی طرح

انھوں نے ان مقدس صحیفوں کے اندر انبیاء کرام کے متعلق ایسی فحش اور بیہودہ باتیں اپنی طرف سے گھڑ کر منسوب کر دیں جن کو سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی اگر تفصیل معلوم کرنی ہو تو دیکھیے خروج باب ۳۲۔ پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰۔۳۸۔ صموئیل دوم باب ۱۱۔ آیت ۲۔۱۳۔

قرآن کی شہادتیں، توریت و انجیل کی تحریف کے بارے میں بالکل صحیح ہیں۔ متعدد جگہ قرآن میں اہل کتاب کے لیے فرمایا گیا ہے کہ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ، قرآن کی یہ بھی شہادت ہے کہ بہت سی باتیں وہ بھول گئے۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ۔ بھولنے کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر اور انتونیوس وغیرہ کی چیرہ دستیوں اور بیت المقدس پر ان کے حملوں اور تباہ کاریوں کے بعد اصلی توریت اور صحف انبیاء ضائع ہو گئے اور اس کے بعد چونکہ مدت تک ان کی تعلیمات کا سلسلہ روایت بالمعنی کے طور پر جاری رہا اور عرصہ دراز کے بعد انھیں روایتوں کو عزرا کاتب نے جمع کر کے موجودہ توریت کو مرتب کیا اس لیے بعض واقعات کی ترتیب میں فرق آ گیا اور بہت سی باتیں اصل میں داخل ہو گئیں اور بہت سی باتیں قید تحریر میں آنے سے رہ گئیں۔ اس کے علاوہ وہ قصداً بھی بہت سی چیزیں چھپاتے تھے اسی لیے خدا نے فرمایا کہ یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ۔ اور بہت سی باتیں وہ اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اصل کتاب میں ملا دیتے تھے خدا فرماتا ہے۔ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ ریورنڈ ٹامسن اپنی کتاب ہسٹری۔ آف دی انگلش بائبل کے صفحہ ۱۲ میں لکھتے ہیں "احبار نے اٹھارہ مقامات میں توریت کو بدل دیا"۔ اور صفحہ ۳۸ پر لکھتے ہیں "لیکن کتاب۔ قاضیون باب ۱۸ آیت ۳۰ کے متن میں قصداً تحریف ہوئی۔ کیونکہ یہوناتان کو جو مرتد ہو کر قوم دان کا کاہن بنا منسّی کا پوتا لکھا ہے حالانکہ وہ موسیٰؑ کا پوتا تھا لیکن احبار نے حضرت موسیٰؑ

کی کسرِ شان کے لحاظ سے یہ مناسب نہ جانا کہ آپ کا پوتا مرتد مشہور ہو، اس لیے آپ کے نام کے عوض منسی[1] لکھدیا۔ جب احبار نے محض اس بنا پر موسیٰؑ کی جگہ پر منسی بنا دیا کہ ان کے نزدیک پوتے کا مرتد مشہور ہونا موسیٰؑ کے لیے باعثِ ننگ و عار تھا تو اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کتنے مقامات پر اپنے عقائد اور خیالات کے مطابق تبدیلی کر دی ہوگی۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ

... عرصہ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ جرح و تعدیل کے مستند اصول سے محروم رہا یہود بھی اسی عبرانی نسخہ کی پیروی کرتے تھے جس کی نسبت مشہور تھا کہ غالباً دوسری صدی عیسوی میں تیار کیا گیا ہے اور بعد ازاں احتیاط سے محفوظ رکھا گیا ہے لیکن اس نسخہ میں چند تحریفیں تو ایسی ہیں جو اب صاف نظر آتی ہیں اور غالباً ایک کافی تعداد ایسی تحریفیں اور بھی موجود ہیں جن کی شاید ابھی پورے طور سے تشخیص نہ ہو سکے۔[2]

یہ وجوہ توریت کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرانے کے لیے بالکل کافی ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی لائقِ اعتبار ہے کہ اصل توریت کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے اہلِ کتاب مدتِ دراز سے صرف اس کے تراجم پر اکتفا کرتے چلے آتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا کا جو اقتباس اوپر درج ہے اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ "عیسائی اور یہود علماء کی حالت اس سے بھی زیادہ بدتر تھی کیونکہ پانچویں صدی عیسوی تک اشاذ و نادر مستثنیات کے اور پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک بلا استثنا ان بزرگوں نے تمام تر ترجموں پر اکتفا کیا ہے۔" چونکہ توریت کی اصل زبان عبرانی میں حروفِ علت نہ تھے اور صحیح حروف میں بھی بعض حروف بعض سے اس قدر مشابہ ہیں کہ ذرا سی بے احتیاطی میں عبارت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور بسا اوقات عبارت میں ایسی مختلف جا ہے کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے مثلاً کتاب اول صموئیل باب ۱۴۔ آیت ۱۸ میں ہے "طالوت نے اخیار سے کہا کہ تابوت کو یہاں لا کیونکہ تابوت اس وقت بنی اسرائیل کے پاس تھا" لیکن محققین کے نزدیک یہ عبارت غلط ہے۔ کیونکہ تابوت اس وقت بنی اسرائیل کے پاس نہیں بلکہ ان کے دشمنوں کے پاس تھا۔ اس لیے

[1] بحوالہ تاریخ صحف سماوی صفحہ ۴۳

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دوم طبع ... بحوالہ تاریخ صحف سماوی

اس وقت کے مشاہیر علما اہل کتاب یہ کہتے ہیں کہ اصل عبارت یوں ہوگی "اور طالوت نے اخیارے کہا کہ جبہ پہنا کیوں کہ اس نے اس وقت جبہ پہنا" چونکہ عبرانی میں جبہ اور تابوت کے حروف مشابہ ہیں اس لیے یہ فرق ہوگیا غور فرمائیے کہ دونوں عبارتوں میں کتنا فرق ہے لیکن ترجمہ کی ذراسی بے احتیاطی نے کیا سے کیا کر دیا ترجمہ کی ذراسی لغزش ہے جب بات اتنی بدل سکتی ہے تو کیا یہ کہنا بجا ہوگا کہ موجودہ بائبل محرف اور ناقابل اعتبار ہے؟

یہاں پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آسمانی صحیفے اس حد تک مسخ اور ناقابل اعتبار ہو چکے تھے تو پھر قرآن نے کیوں اس سے جا بجا حجت پیش کی ہے اور کیوں اہل کتاب کو اس کی اقامت اور پیروی کا حکم دیا ہے اور کیوں مومنین اہل کتاب کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہ سوال یقیناً اہم ہے اور ضرورت ہے کہ اس قسم کی ہدایات کو الگ کر کے اس کا جواب دیا جائے لیکن اس وقت میں اس تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا، انشاء اللہ پھر کبھی اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی لیکن مختصراً اسے یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں جہاں جہاں توریت وانجیل کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا ان میں سے کسی چیز سے استدلال کیا گیا ہے وہاں پر توریت وانجیل سے وہ توریت وانجیل مراد نہیں جس کو یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی بدبختی سے مسخ کر دیا بلکہ وہ کتابیں مراد ہیں جو ان ناموں کی، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جگہ اللہ تعالیٰ نے توریت وانجیل کے الفاظ کی جگہ پر، مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ اور مَا بَیْنَ یَدَیْہِ (القرآن) وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں کیونکہ توریت وانجیل اگرچہ قرآن میں، اصلی توریت وانجیل ہی کے لیے بولا گیا ہے لیکن اس سے محرف توریت وانجیل کی طرف بھی ذہن منتقل ہو جاتا ہے بخلاف مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وغیرہ کے کہ اس سے بہر حال وہ اصلی اور حقیقی تعلیمات وشرائع ہی مراد ہوں گی جو ان نبیوں پر نازل ہوئیں۔

یہ دیکھ کر واقعی سخت صدمہ ہوتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے مقدس صحیفوں کو اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ ان کے اندر اصلی تعلیمات کا پتہ لگانا دشوار ہو گیا ہے۔ اور زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ اصلی توریت و

انجیل کے ضایع ہو جانے اور ان کے محرف اور غلط ترجموں کی کثرت اشاعت اور شہرت کی وجہ سے بائبل کی تلافی اور تصحیح کا کوئی موقع باقی نہیں رہا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب نازل فرما کر تورات و انجیل کی بہت سی اہم تحریفات کا پردہ چاک کیا اور لوگوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ قرآن کے اندر اگلی کتابوں کی تفصیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ۔ ایک جگہ ہے۔ إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے زیادہ تر بائبل کی انہی تحریفات کے اور ان کی چھپائی ہوئی باتوں میں انہیں باتوں کے اظہار و کشف کی طرف توجہ کی ہے جن کا تعلق شریعت محمدیؐ کے کسی خاص اہم پہلو سے تھا۔ اس لیے بہت سی باتیں اب بھی روشن نہ ہو سکیں اور ان پر تحریف اور نسیان کا پردہ پڑا رہا۔ مذکورہ بالا آیتوں میں دیکھیے کہ يَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ کی تصریح کے علاوہ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ فرمایا ہے اس کی وجہ یہی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا اس لیے لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بائبل کے اندر ان مقامات کے علاوہ جن کی تحریف کی طرف اشارہ کیا گیا۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں جو محرف اور غلط ہیں یہی وجہ ہے کہ بائبل کی بہت سی باتیں، قرآن کی بیان کردہ باتوں سے متضاد اور مخالف ہیں یہاں تک کہ قصص و حکایات کے اندر بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے حالانکہ ان کے اندر اختلاف نہیں ہونا چاہیے کیونکہ واقعات زمانہ کے ساتھ بدل نہیں جایا کرتے لیکن چونکہ اہل کتاب نے بہت سی باتیں قصداً اپنے مروجہ عقاید یا اپنے اغراض و اہواء کے مطابق بدل دیں اور اصل نسخوں کے ضائع ہو جانے کے بعد مدت کے بعد بائبل کی ترتیب وقوع میں آئی اس لیے لابد کہ اس قسم کے مواقع پر عموماً پیش آتا ہے بہت سی باتیں لکھی نہ جاسکیں بہت سی زاید باتیں داخل ہو گئیں اور بہت سے واقعات کی ترتیب میں فرق آگیا اسی کے ساتھ ترجموں کی غلطیوں کی وجہ سے بہت سی باتیں اپنی اصل صورت

میں باقی نہ رہیں۔ ان وجوہ سے قرآن اور بائبل کے قصوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا اس اختلاف کے کرشمے تو اکثر جگہ نظر آتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت یوسف ؑ کا قصہ، توریت میں قرآن سے بہت زیادہ مختلف ہے آج میں اسی اختلاف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے قبل بطور تمہید کے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ اہل کتاب نے اپنے اغراض واہوا کے مطابق اصل کتاب میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں یا سہو، نسیان اور ترجمہ کی وجہ سے ہوگئی ہیں جس کی بنا پر بعض قصوں کے بعض یا اکثر اجزاء مشکوک اور مشتبہ ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر قصص ایسے ہیں جنمیں بظاہر تحریف کا کوئی داعیہ موجود نہیں تھا اس لیے وہ تحریف سے بھی محفوظ ہوں گے۔ اس بنا پر توریت کے قصص اس وقت تک صحیح باور کیے جاسکتے ہیں جب تک کسی عقلی یا نقلی دلیل سے ان کا غلط ہونا معلوم نہ ہوجائے، اس لیے توریت کے مطالعہ کے وقت حسب ذیل اصول کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

۱- اختلاف بیان اور تضاد کے موقع پر، قرآن کا بیان قابل یقین ہے کیونکہ قرآن متواتر ہے محفوظ ہے، بخلاف توریت کے کہ اس کا محرف اور غیر محفوظ ہونا سطور بالا میں، قرآن اور محققین کے بیانات سے ثابت ہوچکا ہے۔

۲- بعض آیات قرآنی کے متعلق، مفسرین نے جو احتمالات پیدا کیے ہیں۔ ان میں اسی احتمال کو قوی تسلیم کیا جائیگا۔ جو توریت کی تصریح کے موافق ہو، بشرطیکہ توریت کی تصریح، کسی عقلی یا نقلی دلیل سے غلط ثابت ہو جائے۔

۳- جو باتیں توریت میں ہیں اور قرآن میں نہیں وہ صدق وکذب دونوں کی متحمل ہیں۔

۴- جو باتیں قرآن میں ہیں اور توریت میں نہیں ان کو ماننا اور ان پر یقین کرنا ضروری ہے کیونکہ توریت میں نہ ہونے سے ان کا غلط ہونا لازم نہیں آتا۔

آئیے اب ان اصول کو پیش نظر رکھکر سورۂ یوسف پر غور کیا جائے۔

سورۂ یوسف میں اور سورتوں کے خلاف مختلف انبیا کرام کے تذکرہ کے بجائے صرف حضرت یوسفؑ کے تذکرہ پر اکتفا کیا گیا ہے اور انہیں کا قصہ عام اسلوب قرآن کے برعکس زیادہ شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے توریت میں بھی اس کی پوری تفصیل موجود ہے لیکن دونوں میں چند حیثیتوں سے اختلاف ہے۔

۱۔ توریت میں قرآن سے کچھ زاید باتیں ہیں۔

۲۔ قرآن میں توریت سے کچھ زاید باتیں ہیں۔

۳۔ قرآن کے بعض بیان، توریت سے متضاد یا مخالف ہیں۔

اب ان میں سے ہر ایک پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۱۔ حضرت یوسفؑ کا قصہ، اگر آپ قرآن اور توریت، دونوں جگہ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو توریت میں بہت کچھ باتیں زیادہ ملیں گی مثلاً توریت میں خواب دیکھنے کے وقت حضرت یوسفؑ کی عمر ان کے بھائیوں کے بکریاں چرانے کی جگہ، جس قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو کنویں سے نکالا اس کا پتہ، خریدنے والے کا نام اس کی بیوی کا نام، اس کا منصب اور حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے نام، اور دوسری چیزیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح اثنا بیان ہی میں، حضرت یوسف کا قصہ، ملتوی کرکے ایک پورے باب میں، یہوداکے ایک عورت کے ساتھ زنا کرنے اور حرامی اولاد پیدا ہونے کا بیان ہے اور حضرت یعقوبؑ کے مصر جانے ان کے استقبال ان کے ساتھ آنے والوں کی تعداد، پھر فرعون کے دربار کی گفتگو، ان کی جائے رہائش، حضرت یعقوبؑ کی موت ان کی وصیتیں اور بہت سی باتیں توریت میں قرآن سے زاید منقول ہیں اسی کے ساتھ واقعات کے بیان میں بہت زیادہ اطناب اور بے سود تکرار سے کام لیا گیا ہے تطویل کے خوف سے میں یہاں توریت سے بے سود تکرار کی ایک مثال پیش کرتا ہوں حضرت یوسف کے بھائی قحط کے سال غلہ لینے کے لیے، کنعان سے مصر آتے ہیں، اس کا بیان توریت میں یوں شروع ہوتا ہے۔

"پس اسرائیل کے بیٹے اور آنے والوں میں ملے ہوئے خرید کرنے آئے کہ کنعان کے ملک میں کال

تھا اور یوسف ملک کا حاکم تھا کہ وہ ملک کے سارے لوگوں کے ہاتھ غلہ بیچتا تھا سو یوسف کے بھائی آئے اور اپنے کو زمین کی طرف جھکائے ہوئے اس کے حضور ترتم ہوئے، یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیکھا اور انھیں پہچان گیا پر اس نے آپ کو ناواقف بنایا اور ان سے سخت بولی بولا اور ان سے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو؟ وے بولے کنعان کی زمین سے کھانے کی چیزیں مول لینے کو.....

اور اس نے انھیں کہا کہ تم جاسوس ہو کر آتے ہو تاکہ اس زمین کی بُری حالت دریافت کرو انھوں نے اس سے کہا نہیں آئے میرے خداوند تیرے غلام کھانے کی چیزیں مول لینے آئے ہیں ہم سب ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں ... تیرے غلام جاسوس نہیں ہیں ... تیرے غلام بارہ بھائی کنعان کے بیچ ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں. اور دیکھو چھوٹا آج کے دن ہمارے باپ کے پاس ہے. اور ایک نہیں ملتا تب یوسف نے انھیں کہا وہی جو میں نے تمہیں کہا کہ تم جاسوس ہو اسی سے تم امتحان کیے جاؤ گے، فرعون کی زندگی کی قسم کہ تم یہاں سے بغیر اس کے کہ تمھارا چھوٹا بھائی یہاں آوے جانے نہ پاؤ گے. ایک کو آپ میں سے بھیجو کہ تمہارے بھائی کو لاوے اور تم قید رہو تاکہ تمہاری باتیں جانچی جاویں، کہ تم سچے ہو کہ نہیں اور نہیں تو فرعون کی جان کی قسم تم یقیناً جاسوس ہو" کتاب پیدائش باب ۴۲ آیت ۵ - ۱۶ -

اس کے بعد تین دن تک قید رہ کر شمعون کے علاوہ سب حضرت یعقوبؑ کے پاس جاتے ہیں اور وہاں اپنی پوری سرگذشت حضرت یعقوبؑ کو سناتے ہیں، اس کو توریت میں یوں بیان کیا گیا ہے -

"وہ شخص جو اس ملک کا مالک ہے ہم سے سختی سے بولا اور ہمیں زمین کے جاسوس ٹھیرایا ہم نے اسے کہا کہ ہم سچے آدمی ہیں ہم جاسوس نہیں ہیں ہم بارہ بھائی ایک باپ کے بیٹے ہیں. ہم میں سے ایک نہیں ملتا اور سب سے جو چھوٹا ہے آج اپنے باپ کے پاس زمین کنعان میں ہے تب اس شخص نے جو ملک کا مالک ہے ہم کو کہا میں اب تمہیں جانچوں گا کہ سچے ہو کہ نہیں اپنا

ایک بھائی مجھ پاس چھوڑ دو۔ اور اپنے گھرانے کے لیے کال کی خورش لو اور جاؤ اور اپنے چھوٹے بھائی کو میرے پاس لے آؤ تب میں جانچوں گا کہ تم جاسوس نہیں بلکہ سچے ہو پھر میں تمہارے بھائی کو تمہارے حوالے کروں گا اور تم ملک میں سوداگری کیجیو۔ پیدائش باب ۴۲ آیت ۳۰ - ۳۵ -

یقیناً۔ یہ تطویل بے کار ہے، یہاں پر صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ مصر آکر ان لوگوں نے اپنے باپ سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اطناب کی مثالیں ملاحظہ فرمانی ہوں تو دیکھیے باب ۴۱ آیت ۱ تا ۸ و ۹ تا ۱۳

لبعض مقامات پر تو اس قدر اطناب اور تطویل سے کام لیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت ایک کوفت سی ہوتی ہے اور کلام بالکل بے مزا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے مقابل میں قرآن کی بلاغت دیکھیے کہ ہر بات اس قدر ایجاز اور اختصار سے بیان کرتا ہے کہ کلام کی شان و وقعت میں بھی فرق آنے نہیں پاتا اور مفہوم بھی خوبی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے، توریت میں جس چیز کا بیان کئی سطروں میں ہوتا ہے، قرآن اسی بات کو صرف چند جملوں میں ادا کر دیتا ہے۔ بادشاہ کے خواب کی تفصیل توریت میں ۸ طویل آیتوں میں ہے لیکن قرآن میں صرف اتنے الفاظ میں ادا کر دیا ہے " قَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ " اس خواب کو قرآن میں دو مرتبہ بیان کرنا پڑا، ایک مرتبہ جب بادشاہ نے اس کو درباریوں کے سامنے بیان کیا دوسری مرتبہ جب ساقی نے تعبیر لینے کے لیے حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش کیا لیکن باوجود اس کے قرآن نے اس کو اس صفائی اور ایجاز کے ساتھ بیان کیا کہ اس سے کسی قسم کی ناگواری نہیں پیدا ہونے پائی۔ توریت کے باب ۴۱۔ آیت ۹ تا ۱۳ میں جو کچھ کہا گیا ہے قرآن نے اس کو ایک آیت میں بیان کر دیا ہے۔ " قَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ "۔ توریت میں ایک موقع یہ ہے:۔

پھر انھوں نے یوسفؑ کی قبائی اور ایک بکری کا بچہ مارا اور اسے اس کے لہو میں تر کیا اور

انھوں نے اسی قبا کو آگے بھیجا اور اپنے باپ کے پاس لے آئے۔ باب ۳۷۔ آیت ۳۱-۳۲۔ قرآن نے اتنی بات کو ایک جملہ میں ادا کر دیا ہے کہ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اس قسم کے ایجاز کی مثالیں اور سورتوں کو چھوڑ کر صرف سورۂ یوسف کے اندر متعدد ملتی ہیں لیکن اختصار کے خیال سے میں انھیں نظر انداز کرتا ہوں۔

توریت کے اطناب و تطویل و تکرار اور قرآن کے ایجاز اور اختصار کو دیکھنے کے بعد اس کے وجوہ و نتائج پر بھی غور کرنا چاہیے۔ کتاب اللہ تدبر کے لیے نازل کی گئی ہے۔ خدا نے فرمایا ہے اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا غور و تدبر فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے بلکہ مقصود اصلی حقیقت شناسی اور معرفت ہے جو غور و تدبر سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں قصص کے بیان میں ایجاز و اجمال سے کام لیا گیا تاکہ غور و فکر کی طاقت میں اضافہ ہو۔ دوسرے کتاب اللہ میں قصوں کے ذکر کی غرض محض تذکیر و موعظت ہے، اس لیے اشخاص و امکنہ کے نام وغیرہ کی تصریح نہیں کی جاتی کہ یہ اصل مقصد کے لیے بیکار ہے اور صرف انھیں اجزاء کو بیان کیا جاتا ہے۔ جو اصل مقصد کے لیے مفید ہوں، قرآن میں کثرت سے انبیاء اور گذشتہ قوموں کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح ایک مورخ ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا تذکرہ بالاستیعاب کرتا ہے بلکہ اس طرح کہ تذکیر و موعظت کے پہلو روشن ہو جائیں۔ توریت میں یہ نکتہ نظر انداز کر دیا گیا ہے اس لیے اس کے اندر غیر ضروری اجزاء درج ہیں۔ لہذا اگر توریت میں قرآن سے کچھ زاید باتیں ملیں تو اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ قرآن میں توریت سے جو زاید باتیں ہیں، ان پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ قرآن کا تواتر اور صحت مسلم اور توریت کا محرف ہونا معلوم ہے۔ اور کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ قرآن میں ہے، ان سب کا توریت میں بھی ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھیے ایسا کیوں ہوا۔ اوپر میں نے ذکر کیا ہے کہ قرآن میں قصص کے بیان کا مقصد محض تذکیر و موعظت ہے، اس لیے قرآن بعض واقعات کے غیر ضروری اجزا

کو حذف کر دیتا ہے کیونکہ ان کا ذکر مقصد کے اعتبار سے بے سود ہوتا ہے اور توریت میں اس کا خیال نہیں کیا جاتا اس لیے وہاں ایک ہی واقعہ کے متعلق قرآن کے بیان کردہ واقعات سے کچھ زاید باتیں بیان ہوی ہیں، اسی طرح قرآن میں جو باتیں زیادہ ہیں اس کی وجہ بھی دراصل یہی ہے کہ توریت کے مرتب کرنے والوں نے ان واقعات کی روایت کا اصل مدعا نظر انداز کر دیا اس لیے بعض بے کار باتیں درج کر دیں اور بہت سی کار آمد باتیں حذف کر دیں لیکن قرآن جس طرح غیر ضروری اجزا کو اصل مقصد کے لحاظ سے بے کار سمجھکر حذف کر دیتا ہے اسی طرح ان اجزا کو جو ضروری ہوتے ہیں، ذکر کرتا ہے اگرچہ توریت اس سے خاموش ہو۔ سورۂ یوسفؑ کا توریت سے موازنہ کیجئے، آپ کو جو باتیں قرآن میں زائد معلوم ہوں گی، غور کرنے سے آپ کو خود یقین ہو جائیگا کہ ان کا ذکر اہم اور ضروری تھا۔ مثلاً توریت میں اگرچہ دُور از کار باتیں بہت زیادہ ہیں لیکن زنان مصر کے کید کا جو حال قرآن میں مذکور ہے اس کا توریت میں کہیں ذکر نہیں حالانکہ حضرت یوسفؑ کی سیرت میں حقیقۃً سب سے زیادہ درخشاں واقعہ یہی ہے کہ انہوں نے عزیز کی بیوی اور دوسری عورتوں کی مختلف قسم کی تدبیروں اور فریب کاریوں کے باوجود بھی اپنی پاک دامنی پر کسی قسم کا دھبہ نہیں آنے دیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کیا جائے لیکن خاص اس واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے جو ان کی زندگی میں بہت زیادہ اہم اور موثر ہو؟ اس لیے قرآن میں اگرچہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں اور لڑکوں کے نام اور حضرت یعقوبؑ کے ساتھ مصر میں داخل ہونے والوں کی تعداد اور دوسری باتیں مذکور نہیں لیکن اس نے تفصیل و صراحت کیساتھ اس واقعہ کو بیان کیا۔ اسی طرح جب دو شخصوں نے حضرت یوسفؑ کے سامنے تعبیر معلوم کرنے کے لیے اپنا خواب بیان کیا تو توریت کے بیان کے مطابق انھوں نے خواب سننے کے ساتھ ہی یہ کہکر کہ تعبیر خدا کے ہاتھ میں ہے تعبیر بتانی شروع کر دی، لیکن قرآن میں ہے کہ وہ موقع کو غنیمت سمجھکر پہلے ان کو تسکین دیتے ہیں کہ تم کو جو کھانا ملتا ہے، اس کے آنے سے قبل ہی میں تمھارے خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ اس کے بعد توحید اور معرفت الٰہی کا ایک نہایت موثر وعظ فرماتے ہیں جو موقع کے لحاظ سے نہایت بلیغ اور جامع ہے اور اس کے بعد پھر چند جملوں

میں خواب کی تعبیر بتا دیتے ہیں۔ قرآن کے اس بیان سے واضح ہوگیا کہ حضرت یوسفؑ صرف تعبیر خواب ہی نہیں بلکہ اس سے بدرجہا بلند نبوت اور اصلاح قوم کے منصب پر فائز ہیں لیکن توریت نے اس سے خاموشی اختیار کرلی۔ اسی طرح توریت نے ایک طرف تو یہاں تک تفصیل بیان کی کہ جس جانور کے خون سے قمیص رنگین کرکے وہ لے آئے تھے اس کو بھی واضح کردیا لیکن یہ نہیں بیان کیا کہ اپنے جھوٹ کو فروغ دینے اور اپنے والد کو مطمئن کردینے کے لیے انھوں نے کیا طریقہ اختیار کیا، قرآن نے انتہائی ایجاز کے ساتھ اس ایک جملہ میں اسے بیان کردیا وَجَاءُوْا اَبَاهُمْ عِشَاءً يَّبْكُوْنَ - اسی طرح جس وقت عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسفؑ پر بدکاری کا الزام لگایا تو قرآن میں ہے کہ اسی عورت کے کسی عزیز نے یہ شہادت دی کہ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ الخ قصہ کے آخر میں خاتمہ پر قرآن حضرت یوسفؑ کی دعا نقل کرتا ہے کہ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ الخ غور کیجیے کہ اگر اس دعا کو نقل نہ کیا جاتا تو یقیناً اس طویل قصہ کے بیان کرنے کی غرض بہت حد تک فوت ہوجاتی توریت میں بجائے اس کے دوسری غیر ضروری چیزوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے لیکن ان کی سیرت کی اس موثر چیز کا تذکرہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۃ الناس

از جناب مولنا عبد القدیر صدیقی

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ میں پناہ لیتا ہوں لوگوں کے پروردگار کی۔ رب کے پالنے والے کی

الناس اصل میں الاناس تھا۔ الف تخفیفاً گرا دیا گیا۔ لام نون ہو کر نون میں مدغم ہوا۔ الناس ہوا۔ بغیر لام کے ناس اور لام کے ساتھ الاناس درست نہیں۔ ماخوذ ہے اَنِسَ (نظر آیا) اَنَسَ (دیکھا ہے)، اور بعض کے نزدیک اَنِسَ (مانوس ہوا) سے۔ انسان مدنی الطبع ہے۔ اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کی فطرۃ میں داخل ہے کہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر رہے ایک دوسرے کی اعانت کرے اور تعاون حاصل کرے۔ مگر جن و انس کا مقابلہ پہلے معنی کی تائید کرتا ہے۔ جن کے مادّے میں چھپنا، استتار مرکوز ہے۔ جَنَّۃ گھنا باغ۔ جنہ مجنۃ۔ مجن سپر۔ ڈھال۔ جنین پیٹ کا بچہ۔ جِنٌّ جَانٌ۔ جِنّی واحد، وہ مخلوق جس میں جزو ناری غالب ہے، بنسبت معمولی انسان کے لطیف ہے مختلف صورتیں لے سکتا ہے۔ ان میں کافر بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ ان میں سے بعض نے سلطان الانبیا کی صحبت کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ مگر فنا اور ولایت انسان کا خاصہ ہے۔ جن و ملائکہ کوئی اس کا سہیم و شریک نہیں یہی وجہ تو ہے کہ وہ تاج خلافت کا استحقاق رکھتا ہے۔

یہاں ایک عالمگیر مغالطہ لوگوں کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز ہم کو معلوم نہیں مشاہد نہیں، وہ موجود ہی نہیں۔ ہر کام کے چند لوگ ماہر ہوتے ہیں۔ جن کو تجربہ نہیں، تحقیق نہیں، اُن کو چاہیے کہ ماہرین فن، اہل تجربہ پر محوّل کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ہم کو تحقیق نہیں

یہ ہمارے پاس ثابت نہیں ۔ یہ کہ ہمارے پاس ثابت نہیں اس لیے موجود ہی نہیں اور اپنے جہل کے مطابق لگیں نا قابل قبول تاویل کرنے ۔ اس دور میں چند ایسے لوگ بھی نکلے ہیں جو روحانیات کے قائل ہیں، مگر ہیں ابھی ابنت ہیں۔ ایسے حال میں جن سے انکار سوائے جہل کے اور کیا ہے۔ ہزارہا چیزیں ایسی ہیں جن کا ابھی تک انکشاف نہیں ہوا۔ ہزارہا چیزیں ایسی ہیں جن کا انکشاف اب ہوا ہے۔ اگر ہمارے سلف اپنی معلومات پر قناعت کرتے، یا جس کی تحقیق نہیں اس سے انکار کر کے بیٹھ رہتے، تو علوم کا اتنا ارتقا کیسے ہوتا، علمی ترقی کا راستہ ہی مسدود ہوتا، اور کوئی نئی بات نکلنے ہی نہ پاتی ۔

یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر کسی نے جن کے معنی بعض وجوہ سے جراثیم کے لیے تو اس پر سخت حملے کرنا بھی بے جا ہے۔ شیطان کے معنی معلوم ہیں۔ مگر کَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ میں شیطان سے مراد سانپ اور رؤس الشیاطین سے مراد ناگ پھنی (چپل سینڈ) لیے گئے ہیں۔ الحق افراط و تفریط بڑی بُری بلا ہے ۔

مَلِكِ النَّاسِ ۔ صرف کھلانے پلانے والا ہی نہیں، وہ لوگوں کا بادشاہ بھی ہے۔ حاکم علی الاطلاق ہے ۔

اِلٰهِ النَّاسِ ۔ تمام لوگوں کا معبود سب کا خدا ۔

سب سے پہلے جسم کا تسویہ ہوتا ہے۔ عناصر و ارکان میں اعتدال خاص پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ شانِ ربوبیت کا تقاضا ہے۔ اس کے بعد نفس ناطقہ یا روح انسانی کو جسم پر حاکم بنایا جاتا ہے جو ملک الناس اور بادشاہ علی الاطلاق کی شان ہے۔ پھر انسان کو تمام علائق مادی سے اعراض اور معبود حقیقی کی طرف توجہ کرنا پڑتا ہے جو الٰہ الناس ہے۔ اس توجہ الی اللہ میں ہزاروں موانع پیش آتے ہیں۔ داخلی بھی خارجی بھی، ظاہری بھی باطنی بھی۔ ان میں سے خطرات و وساوس، تخیلات و احادیث نفس کو بڑی اہمیت ہے، جن سے استعاذہ ضروری

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۔

شر کی تحقیق سورہ فلق میں ہو گی۔ اس کے مادے میں پھیلنا اور بُرائی پائی جاتی ہے۔ شرارہ

آگ کی چنگاری جو اڑتی اور منتشر ہوتی ہے۔

الوسواس ۔وسوسے ڈالنے والا، خطرات پیدا کرنے والا۔ وسوسے کے لفظ سے ایک اضطرابی ترددی حرکت محسوس ہوتی ہے۔

الخنّاس، پیچھے ہٹنے والا، خنس کے معنی ہیں پیچھے ہٹنے، دبنے کے۔ خنساء، سریا گائے جس کی ناک ذرا چپٹی ہوتی ہے۔

اکثر وسوسے اچھا کھانے، اچھا پہننے اور جماع کے ہوتے ہیں، جو نزولی اور پستی کے ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک خطرات چار قسم کے ہوتے ہیں۔ شیطانی، نفسانی، ملکی، رحمانی:۔

خطرۂ شیطانی بد اعتقادی، گناہ، بے صبری، بے توکلی، تقدیر الٰہی سے نارضامندی پر برانگیختہ کرتا ہے۔

خطرۂ نفسانی، کھانے، پینے اور جماع کے لیے ہوتا ہے، اس لیے ہزار ہٹائیں، یہ خطرہ نہیں ہٹتا۔ شیطان نفس سے سازش کرلیتا ہے، اور مقاصد نفس ناجائز وسائل سے حاصل کرنے کے لیے اکساتا ہے۔ نفس غریب ایک قسم کا جانور ہے، بہیمہ صفت۔ اس کو جائز ناجائز سے کوئی غرض نہیں جس طرح ہو اس کا مقصد پورا کیا جائے مگر نفس میں ایک قابل تعریف وصف بھی ہے۔ جس چیز کی عادت ڈالی جائے، جیسی تربیت کی جائے پھر اسی کے موافق کام کرے گا۔ چند روز نماز کی عادت کی جائے، پھر دیکھیے، نماز کا وقت آیا اور نفس مستعد ہوا۔ چند روز تہجد کو اٹھیے، پھر وقت آیا اور آنکھ کھلی۔ ٹھنڈے پانی سے نہا کر، وضو کرکے نماز پڑھنے کو نفس تیار۔ نہ چوں ہے نہ چرا۔

خطرۂ ملکی جس طرح شیطان آدمی کو گمراہ کرنے میں کمربستہ ہے اُسی طرح فرشتہ نیک مشورہ دینے میں گرم، شیطانی خطرے کی غلطی بتلانے میں کوشاں۔

خطرہ رحمانی، الہام ربانی ہے۔ اس خطرہ سے تقادیر الٰہیہ کے حکم و مصالح ظاہر ہوتے ہیں۔ اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ رضا و تسلیم کی عادت ہوتی ہے۔ ایمان قوی ہوتا ہے۔ خطرۂ رحمانی دل میں ایسا آتا ہے

جیسے مالک مکان اپنے مکان میں اطمینان سے داخل ہوتا ہے۔ شیطانی خطرہ دل میں ایسا آتا ہے جیسے چور کسی بادشاہ کے محل میں گھسے، ایک قدم آگے بڑھاتا ہے، پھر ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے۔ یہی معنی ہیں خناس کے، اور اسی کی طرف اشارہ ہے دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ میں یعنی چھوڑ دے جو تیرے دل میں خلش پیدا کرے۔

شیطانی خطرہ سے بچنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ ابو حامد محمد غزالی کی کتابیں تہذیب نفس میں دوسری کتابوں سے امتیاز خاص رکھتی ہیں، جیسے احیاء العلوم اور اس کا ترجمہ مذاق العارفین، کیمیائے سعادت اور اس کا ترجمہ اکسیر ہدایت۔ چند مجرب طریقے میں بھی لکھتا ہوں، امید ہے کہ فائدے سے خالی نہ ہوں گے۔

یہ خیال کرنا کہ خطرے سے بھاگا چلا جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں خطرہ رہ جائے گا۔ اور تم اس سے رہائی پاؤ گے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کہنا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ

پڑھ کر اللہ اللہ کا دل پر ضرب کرنا۔

يَا خَلَّاقُ يَا فَعَّالُ پڑھنا۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ پڑھنا

حالت بدل دینا، مثلاً کھڑے ہیں تو بیٹھ جانا، لیٹے ہیں تو اٹھ بیٹھنا۔ اکثر لکھے پڑھے حضرات کو تخیلات کی بڑی عادت رہتی ہے۔

اپنی ساری عمر کا اجمالی اور آئندہ دو روز کا تفصیلی نظام العمل دل میں تیار کر لینا چاہیے جب تصفیہ مسئلہ کا دوبارہ خیال آجائے تو دل میں کہنا چاہیے کہ پہلے اس کا تصفیہ ہو چکا ہے۔ بے فائدہ پھر وہی خیال کیوں آیا۔

جہاں کوئی خیال آئے کہ مجھے یہ چاہیے، اور میں اس امر کو اس طرح حاصل کرونگا، تو فوراً اس کو دعا میں مبدل کردے اور کہے خدایا مجھے یہ چاہیے اور میں اس کو اس طرح حاصل کرنا چاہتا ہوں، تو یہ شئے مجھے عطا کر، اور اس کے حصول میں تو میری رہنمائی کر، بس جتنا سوچنا چاہتے ہو، سوچا کرو، تمہارے تخیلات دعا میں مبدل ہوجائیں گے۔ دعا مخ العبادت ہے۔ بھلا شیطان اس کو کیوں روا رکھیگا۔ فوراً خطرات بند ہوجائیں گے شیطان کا مقصد تو یاد الٰہی سے روکنا اور تضیع اوقات اور بربادی عمر ہے جب وہ اپنا مطلب فوت ہوتے دیکھے گا، فوراً پہلا مکر چھوڑ دیگا اور دوسری تدبیر سوچے گا۔

مگر سب طریقوں سے بہتر وہ طریقہ ہے جس کی تعلیم خدا نے دی ہے، اور وہ استعاذہ ہے۔ استعاذہ دعا ہے، اور دعا مخ العبادت ہے۔ بندے ہو تو اپنی کسی قوت پر اعتماد نہ کرو۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّابِاللّٰہِ اپنے مالک کی پناہ میں آجاؤ، وہ تمہارے لیے بالکل کافی ہے۔ وہی مجیب الدعوات ہے، وہی کافی المہمات ہے۔ اس سے بغاوت، اس سے عدول حکمی کو چھوڑ کر اس کے دامن رحمت میں پناہ لوگے تو تم کو کون ستا سکتا ہے۔ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ ۔ تم کو کون گمراہ کر سکتا ہے، وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ، جو لوگوں کے یا غافلوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے، وہ جنوں میں سے بھی ہے اور آدمیوں میں سے بھی۔

اَلنَّاس، لوگ۔ ہو سکتا ہے کہ لام استغراق ہو اور الناس کی اصل اناسی ہو، یعنی بھولنے والا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ ہمیشہ پاس انفاس کرتے ہیں، دوام حضور اُن کا خاصہ ہے یاد حق میں وہ محو رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک شیطان پھٹک نہیں سکتا، نہ اس کے وسوسے ان پر چل سکتے ہیں۔

خانۂ خالی را دیو میگرد۔

جس کے من میں سائیں بسا ہو دوجا کون سمائے

یاد رکھو کہ آگ میں سے گرمی، برف میں سے سردی پھیلتی ہے۔ عطر میں سے خوشبو، پلیدی میں سے بدبو منتشر ہوتی ہے۔ اسی طرح نیک میں سے نیکی کا اور بد میں سے بدی کا تموج ہوتا ہے اگر پانی کی سطح پر دو کنکر ڈالے جائیں، ان میں سے ایک بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا، تو ان کے گرنے سے جو تموج ہوگا اور دائرے پیدا ہوں گے، بڑے کا دائرہ بڑا اور قوی ہوگا، اور چھوٹے کے دائرہ کو مضمحل کرکے اپنے دائرے میں مستحیل کرے گا۔ اسی طرح بہت نیک آدمی کی صحبت سے معمولی برا نیک ہو جائیگا۔ اور بہت برے کی صحبت سے معمولی اچھا آدمی بھی برا ہو جائے گا۔ اَلطَّبعُ یَسْرِقُ مِنَ الطَّبعِ طبیعت طبیعت سے اثر لیتی ہے، خواہ شیطان سے ہو یا شیطان صفت انسان سے شیطان سے بچنا اتنا دشوار نہیں جتنا شیطان صفت انسانوں سے۔

اے بسا ابلیس آدم روے ہست

مثلاً مخرب اخلاق ناٹک، خانہ برباد سینما سے ایک جوان بچہ بچتا ہے، مگر اس کا ہم سن، ہم جماعت جوان آتا ہے، اور اپنے ساتھ اس کو پکڑ لے جاتا ہے، اپنا روپیہ خرچ کرتا ہے، تماشا دکھاتا ہے، چند روز میں وہ بھی عادی ہو جاتا ہے۔ رنگ میں رنگ مل جاتا ہے۔ ۳۔ مذہب کیا کسی جاہل نے بنائے ہیں بھلا جاہل مذہب کیا بنائے گا۔ اس کی سنے گا کون۔ یہ تو علماء سوء کا کام ہے۔ ان ظالموں نے اسلام کو پارہ پارہ کر دیا۔

بعض مشائخ عظام نکلے ہیں، بئس الفقیر علی باب الامیر وعوت کا سنت ہونا ان کو یاد ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وجوب یاد نہیں بعض علماء و مشائخ دونوں زمروں میں داخل ہیں ان کے کیا کہنے نیم چڑھے کریلے ہیں۔ ظالموں کی تعریف، ان کی خباثتوں کی توجیہ، قرآن حدیث سے تائید، صریح محرمات کی تاویل ان کی ذکاوت و ذہانت پر دلیل روشن ہے۔ جب پیشوایان ملت، دیان مذہب کا حال یہ ہو تو جہال، دنیاداروں، زرپرستوں کا کیا حال پوچھتے ہو۔ نہ دین سے غرض نہ اسلام سے مقصد۔ ان کا شکر یہ کہ مردم شماری میں اپنا نام مسلمانوں میں لکھوا دیتے ہیں۔ بعض عہدہ دار مسلمانوں کے متعلق

اس قدر بری رائے رکھتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم کا مقدمہ ہو تو مسلم ہونا اُن کے پاس ثبوت جرم کے لیے بالکل کافی ہے۔ اگر فیصلہ عدالت ماتحت کا ہو تو اُن کے فرائض میں ہے کہ مسلم کی سزا میں زیادت کردیں انتہائی سزا لگادیں۔ یہ ہیں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ میں کے الناس۔ ان رب کے شر سے استعاذہ ضرور ہے، کیوں کہ صرف ان کی صورت دیکھنے سے دل پر تاریکی آتی ہے۔

اللّٰھم انی اعوذ بك من شر نفسی، ومن شر الشیطان الرجیم، ومن کل دابۃٍ انت اٰخذٌ بناصیتھا، ان ربی علٰی صراط مستقیم۔

حاملان قرآن

شیخ خیرالدین عمادی

اشرب ھنیئاً، علیك لنوبھر تفعاً — من السموات دارًا منك محلا لا
تلك المکارم، لاقعبان من لبنٍ — شیبا بماءِ فعادا بعد ابوالا

(از)

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی، بی ایس سی (علیگ)

احمد نام خیرالدین خطاب، خیر دین جبین روشن سے مستبین، حضرت شیخ عبدالسلام قلندر سے اجازت خلافت حاصل تھی، ہمیشہ مست حق رہا کرتے تھے، آپ کے عہد میں امرتوا ولولہ تہلیل وغلغلہ تکبیر و زمزمہ تسبیح سے ہر وقت معمور رہتا، طلاب و مریدین کا ایک جم غفیر مدرسہ اور خانقاہ میں ہر آن ذاکر حق رہتا، جوار کے مشرکین وکفار کی حمیت جاہلیت وعصبیت وثنیت میں حرکت آئی اور ایک ناگہانی شبخون میں تمام اہل ذکر سے اس معمورہ کو خالی کرالیا، شیخ نے پائندہ پور میں اقامت اختیار کی جو مرزا پائندہ بیگ کا آباد کردہ ہے کہ دولت شرقیہ کے معارف ملوک میں تھے، انھیں اشراف ملوک میں آپ نے شادی بھی کی اور وہیں رفیق اعلی سے جاملے۔

حلقۂ درس کلام اللہ پر مقصور تھا جس کا ہر حال میں التزام رہتا، حالت جلا میں بھی جلائے معانی وتجلیۂ مبانی کا شغل نہ چھوٹا، ایک ایسے ہی موقع پر جب کہ طبیعت کی گرفتگی نے افسردگی کا تمام سامان فراہم کر رکھا تھا ایک مستفید نے یہ آیت تلاوت کی۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰىٓ اِلَيْكَ وَ — جو وحی تجھ پر نازل ہوتی ہے شاید تو اس میں سے کچھ چھوڑ دے

ضَآئِقٌ بِہٖ صَدْرُکَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَآ	والا ہے سینہ کی تنگی میں مبتلا ہونے والا ہے۔ یہ اس بنا پر
اُنْزِلَ عَلَیْہِ کَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ اِنَّمَآ	کہ کفار کہتے ہیں اس پیغمبر پر کوئی خزانہ کیوں نہ اترا یا اس
اَنْتَ نَذِیْرٌ وَّاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ	کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔ اے پیغمبر تیری حیثیت اس

سے زیادہ نہیں کہ تو ایک ڈرانے والا ہے وہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز پر نگہبان ہے[1]۔

ترک تبلیغ وحی | عرض کی: پیغمبر کا مقدس فریضہ ہے کہ جو وحی الٰہی اس پر نازل ہو تمام و کمال قوم تک پہنچا دے کوئی مصلحت اس میں تہاون کی روادار نہیں ہو سکتی، ایسی خیانت جب کسی پیغمبر سے ہو ہی نہیں سکتی تو اس پر تنبیہ لاحاصل ہے۔ فرمایا:۔

انھم کانوا لایعتقدون بالقرآن و	کفار کو قرآن کریم پر اعتقاد نہ تھا اس کے ساتھ سکی میں پیش
یتھاونون بہ فکان یضیق صدر الرسول	آتے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دل تنگ ہو جاتے
صلی اللہ علیہ وسلم ان یلقی الیھم مالا	کہ جو آن پر پیش کرتے ہیں مانتے ہی نہیں ہنسی اڑاتے ہیں
یقبلونہ ویضحکون منہ فھیجہ اللہ	اس دل تنگی کا اثر زائل کرنے کے لیے اللہ تعالی نے
تعالی لاداء الرسالۃ وطرح المبالاۃ	آنحضرت کو برانگیختہ کیا کہ فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کفار
بکلماتھم الفاسدۃ وترک الالتفات	کی پروانہ کریں اور ان کے استہزاء و تمسخر کی جانب ملتفت
الی استھزائھم۔	ہی نہ ہوں۔
تحمل ضرر | والغرض منہ التنبیہ علی انہ	غرض یہ ہے کہ پیغمبر اچھی طرح متنبہ ہو جائیں کہ دو صورتوں
ان ادی ذٰلک الوحی وقع فی سخریتھم	میں سے ایک صورت بہرحال واقع ہوگی، اگر وحی الٰہی کا
وسفاھتھم وان لم یؤد ذٰلک الوحی	فرض ادا کیا تو کفار کے تمسخر و سفاہت کا نشانہ بننا
الیھم وقع فی ترک وحی اللہ تعالی و فی	پڑا اور اگر یہ فرض ادا نہ کیا تو وحی الٰہی کو ترک اور
ایقاع الخیانۃ فاذا لابد من تحمل احد	اس میں خیانت کرنی پڑی، یہ دونوں ضرر ہیں اور ان

[1] واللہ علی کل شیء وکیل میں وکیل کا ترجمہ اس قول پر مبنی تر جس میں تصریح ہے کہ معنی "وکیل" "حفیظ" ای یحفظ علیھم اعمالھم ویجازیھم بھا"

الضررین وتحمل ضرر سفاهتهم اسهل من تحمل ایقاع الخیانه فی وحی الله تعالیٰ۔

دونوں میں سے کسی ایک کو جب برداشت کرنا ہی ہے تو اللہ کی وحی میں خیانت کرنے کی مضرت برداشت کرنے سے یہ کہیں زیادہ آسان ہے کہ کفار کی سفاہت برداشت کرلی جائے

اختیار اھون البلیتین | وفی ذکر هذا الکلام التنبیه علیٰ هذه الدقیقه الانسان اذا علم ان کل واحد من طرفی الفعل والترك یشتمل علیٰ ضرر عظیم ثم علم ان الضرر فی جانب الترك اعظم واقوی سهل علیه ذلك الفعل وخف۔

منشائے کلام یہ ہے کہ یہ باریکی تاریکی میں نہ رہے اور اس کی تنبیہ ہو جائے، انسان کو جب یہ علم ہوتا ہے کہ فعل و ترک فعل دونوں میں ضرر تو ہے مگر فعل سے ترک فعل کا ضرر بڑھا ہوا ہے تو فعل اس پر آسان وسبک ہو جاتا ہے

کلمۂ شک | عرض کی:۔ آیت کی ابتدا فلعلك سے ہوئی ہے لعلّ (شاید) کلمۂ شک ہے پھر یہاں محل شک کیا ہے؟ فرمایا:۔

المراد منها الزجر والعرب تقول للرجل اذا اراد ابعاده عن امر لعلك تقدر ان تفعل کذا مع انه لا شك فیه ویقول لولده لو امره لعلك تقصر فیما امرتك به ویرید توکید الامر فمعناه لا تترك۔

لعلّ (شاید) سے زجر مراد ہے جب کسی شئے سے کسی کو ہٹانا چاہتے ہیں تو محاورہ عرب میں کہتے ہیں لعلك تقدر ان تفعل کذا (شاید تم ایسا کرسکو) حالانکہ اس میں شک کی مطلق گنجایش نہیں، اسی طرح بیٹے کو کہیں گے۔ لعلك تقصر فیما امرتك به (میں نے تمھیں جو حکم دیا ہے شاید تم اس میں کوتاہی کرو) مطلب صرف تاکید ہے یعنی خبردار اس کو ترک نہ کرنا۔

ضیق صدر | عرض کی:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انشراح مسلّم، جس کو شرحِ صدر حاصل ہو اُس کے سا

ضیق صدر کی نسبت کیسی؟ فرمایا:۔

الضائق فی قوله تعالیٰ وضائق به صدرك بمعنى الضيق والفرق بينهما ان الضائق يكون بضيق عارض غير لازم لان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان افسح الناس صدرا ومثله قولك زيد سيد جواد تريد السيادة والجود الثابتين المستقرين فيه فاذا اردت الحدوث قلت سائد وجائد والمعنى ضائق صدرك لاجل ان يقولوا لولا انزل عليه۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں ضائق بہ صدرک (اس کی وجہ سے کیا تم اپنے سینہ میں تنگی لانا چاہتے ہو) فرمایا وہاں ضائق کے معنی ضیق ہی کے ہیں البتہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ضائق وہ ہے جو کسی عارضی ضیق میں مبتلا ہو کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی فراخ سینہ و کشادہ دل تھے کسی ضیق کا آپ کے ساتھ لزوم ممکن نہ تھا اس کی مثال یوں ہے کہ زید کو سید اور جواد کہیں مطلب یہ ہوگا کہ سیادت وجود کے صفات زید میں اس طرح ثبات و استقرار رکھتے ہیں کہ ہٹائے ہٹ نہیں سکتے لیکن اگر عارضی سیادت وجود کا تذکرہ مقصود ہو تو سائد و جائد کہیں گے سید و جواد نہ کہیں گے آیت کے معنی یہ ہیں کہ محض اتنی بات سے کہ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی خزانہ کیوں نہ اترا تم اپنے سینہ میں کچھ دیر کے لیے ضیق و تنگی کو راہ دینے والے ہو؟

تحدی کی صورتیں عرض کی۔ اس کے بعد یہ آیت ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔

یا یہ کہیں کہ قرآن کو پیغمبر نے خود تصنیف کر کے اللہ پر افترا باندھا ہے، کہو کہ یہی بات ہے تو ایسی ہی دس سورتیں تم بھی بنا کے لاؤ اور اللہ کے علاوہ جسے چاہو بلاؤ اپنا شریک بناؤ اگر تم سچے ہو۔

اس آیت میں کفار کو تحدی (چیلنج) کی گئی ہے کہ قرآن کریم کو اگر تم کلام اللہ نہیں مانتے تو ویسی دس قرآنی

سورتیں ہیں ایسی ہی تم بھی دس سورتیں بنا لاؤ۔ کیا قرآن کریم کی یہ کوئی خاص سورتیں تھیں یا عام حکم تھا؟ فرمایا:-

هذه السور التي وقع بها هذا التحدي معينة وهي سورة البقرة و آل عمران والنساء والمائدة والانعام والاعراف والانفال والتوبة ويونس وهود عليهما السلام۔

یہ سورتیں جن پر تحدی واقع ہوئی معین و مقرر تھیں یعنی سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف، انفال، توبہ، یونسؑ، ہودؑ۔

هذه السورة مكية وبعض السور المتقدمة على هذه السورة مدنية فكيف يمكن ان يكون المراد من هذه العشر سور التي ما نزلت عند هذا الكلام فالاولى ان يقال التحدي وقع بمطلق السور۔

یہ سورۂ ہود کی آیت ہے، سورہ ہودؑ کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا تھا تحدی کے لیے جو سورتیں مقرر کی گئیں، ان میں بعض ایسی ہیں کہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں، کیسے ممکن ہے کہ جو سورۃ ہنوز نازل ہی نہ ہوئی ہو اس کو تحدی میں پیش کیا جائے، بہتر یہی قول ہے کہ تحدی عام تھی کسی سورت کی تخصیص نہ تھی۔

ایک کے بعد دس یا دس کے بعد ایک؟ عرض کی:- سورۂ ہودؑ سے پہلے سورہ بقرہ اور سورۂ یونسؑ ہے جن میں ایک ہی سورۃ بنا لانے کی تحدی کی گئی ہے، پھر یہاں دس سورۃ کی تحدی کیسی؟ فرمایا:-

ان التحدي بعشر سور سابق على التحدي بسورة واحدة وهو مثل ان يقول الرجل لغيره اكتب عشرة أسطر مثل ما اكتب فاذا ظهر عجزه عنه قال قد اقتصرت

پہلے دس سورتوں کی تحدی کی پھر ایک سورۃ کی جیسے کوئی کسی سے کہے کہ میری ہی طرح تم بھی دس سطریں لکھ تو لاؤ، جب حریف ایسا نہ کر سکے تو پھر کہے اچھا ایسی ایک ہی سطر سہی، ایک سورت کی تحدی سورہ بقرہ اور سورہ یونسؑ

منها علی سطر واحد مثله فالتحدی بالسورة الواحدة ورد فی سورة البقرة وفی سورة یونسؑ اما تقدم هذه السورة علی سورة البقرة فظاهر لان هذه السورة مکیۃ واما فی سورة یونسؑ فالاشکال زائل ایضاً لان کل واحدة من هاتین السورتین مکیة ویظهر ان تکون سورة هود متقدمة فی النزول علی سورة یونسؑ۔

میں ہے لیکن یہ سورہ (سورہ ہودؑ) ظاہر ہے کہ سورۂ بقرہ پر متقدم ہے اس سورت کا نزول مکۂ مبارکہ میں ہوا اور بقرہ مدینہ امینہ میں اتری تھی، رہی یہ بات کہ سورہ ہودؑ کی طرح سورہ یونس بھی مکی ہے یہاں بھی اعتراض قائم نہیں رہتا اس لیے کہ دونوں سورتیں مکہ شریفہ ہی میں نازل ہوئیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سورۂ ہودؑ کا نزول ہوا پھر یونسؑ کا۔

ربط کلام | کلام بلیغ کا ہر فقرہ مربوط ہونا چاہیے آیت لاحقہ میں کفار کے عجز اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی توثیق کے ساتھ ہی لا الٰہ الا ہو بالکل بے ربط نظر آتا ہے۔

فرمایا: پوری آیت پڑھو:۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُونَ۔

اس پر بھی کفار اگر تمہاری بات نہ مانیں تو جان لو کہ قرآن حقیقت میں اللہ کے علم سے اترا ہے اور یہ بھی جانے رہو کہ بجز اس کے اور کوئی معبود نہیں لہٰذا کیا تم اسے تسلیم کرتے ہو؟

یہ شبہ پہلے بھی پیدا ہو چکا تھا کہ ای تعلق لقوله وان لا اله الا هو بعجزهم عن المعارضة حقیقت حال یہ ہے۔

انه تعالی لما امر محمدا صلی اللہ علیہ وسلم حتی یطلب من الکفار ان یستجیبوا بالاصنام فی تحقیق المعارضة ثم ظهر

اللہ تعالیٰ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے یہ کہنے کا حکم دیا کہ قرآن کریم کا مقابلہ کرنا ہے تو اپنے بتوں سے مدد مانگو تو یہ بات آخر کھل گئی کہ بت اُن کو مدد

عجزهم عنها فحينئذٍ ظهر انها لا
تنفع ولا تضر في شيءٍ من المطالب
البتة ومتى كان كذالك فقد بطل
القول باثبات كونها آلهةً فصارَ
عجز القوم عن المعارضة بعد الاستعانة
بالاصنام مبطلاً لالهية الاصنام و
دليلاً على ثبوت نبوة محمد صلى الله
عليه وسلم فكان قوله وان لا اله
الا هو اشارة الى ما ظهر من فساد
القول بالهية الاصنام

نہیں دے سکتے اسی وقت یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ کسی بات
میں بھی بت کسی کو نفع و ضرر نہیں پہونچا سکتے جب یہ
صورت ہوئی تو بتوں کے معبود ہونے کا عقیدہ بھی
باطل ہوگیا اور اس کا کوئی ثبوت نہیں رہا۔ ان لوگوں
نے بتوں سے مدد بھی مانگی اور پھر بھی قرآن کا مقابلہ
کرنے سے عاجز رہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ثابت
ہوا کہ بت معبود نہیں ورنہ اپنے پوجاریوں کو مدد
دیتے دوسری طرف یہ ثبوت ملا کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نبی برحق ہیں لہذا اس مقام پر لا الہ الا ہو
کہنے میں عقیدۂ الوہیت اصنام کے فاسد ہونے اور
اس کی خرابی کے نمایاں ہوجانے کی جانب اشارہ تھا

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۶) رسالت اور اس کے احکام

صحبت گذشتہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو تمام حیثیات سے دوسرے انسانوں جیسا انسان ہو ایک خاص عمر کو پہنچنے کے بعد خدا کی طرف سے نزول وحی کے لیے چن لیا جائے۔ اور بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی رائے، اس کے خیالات اس کے اعمال اس کے احکام اور اس کے فیصلے غیر نبی انسانوں سے ممتاز نہ ہوں، جیسا کہ نام نہاد اہل قرآن کا گمان ہے، یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیل کتاب کے ساتھ ساتھ اس کو احکام کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتا دی گئی ہوں، اور اس خاص امتیاز کی حیثیت سے قطع نظر کرکے وہ عام امیروں جیسا امیر اور عام قاضیوں جیسا قاضی اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر رہو، جیسا کہ مولانا اسلم جیراج پوری کا خیال ہے۔ اسی طرح نبوت کی حقیقت یہ بھی نہیں کہ نبی کی ذات بشریہ پر نبوت عارض ہوتی ہو اور اس کے عروض کے بعد بھی نبی کی بشریت اور اس کی نبوت دونوں علیحدہ علیحدہ ہوں حتی کہ ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کرکے صرف اس شعبہ کو اطاعت و اتباع کے لیے منتخب کرسکیں جو نبوت سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ ہمارے دوست چودھری غلام احمد صاحب پرویز کا خیال ہے۔ یہ تینوں خیالات بے اصل ہیں اور اس کے برعکس قرآن مجید سے نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے، اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اگرچہ بشر ہے، اور ان تمام حدود سے محدود ہے جو حق تعالی

نے فطرت بشریہ کے لیے مقرر فرمائی ہیں، لیکن ان حدود کے اندر اس کی بشریت آخری اور انتہائی درجہ کی کامل و اکمل بشریت ہے جس میں وہ تمام قوتیں بدرجہ اتم حاصل ہوتی ہیں، جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں۔ اس کے جسمانی، نفسانی، عقلی و روحانی قویٰ عدل و تسویہ کے انتہائی مقام پر پہنچے ہیں۔ اس کے ادراکات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ بلا کسی غور و فکر کے محض اپنے وجدان سے اس الہام الٰہی کو پا لیتا ہے جس کی طرف فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت اتنی صحیح ہوتی ہے کہ وہ کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر صرف اپنے میل طبعی سے فجور کی راہ چھوڑ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا قلب اتنا سلیم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جو اس کے سامنے آئے اس الٰہی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے جس کی طرف وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے قلب کی سلامت اور فطرت کی صحت اس کو خود بخود ان راستوں سے ہٹا دیتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں، اور وہ آپ سے آپ ان راستوں پر چلتا ہے جو مرضات الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ یہی کامل و اکمل بشریت ہے جس کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے، اور یہی چیز ہے جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ کر ہدایت عام کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے، حق تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پاکر سراج منیر بنتی ہے، مصالح عامۂ بشریہ کے لیے تعلیمات اور احکام کا مہبط قرار پاتی ہے، اور اصطلاح میں نبوت و رسالت سے موسوم ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض ہے جو ایک خاص وقت میں نبی کے جوہر انسانیت پر عارض ہوتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی انسانیت کاملہ کا جوہر ہے جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے، اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخرکار نبوت بنا دیا جاتا ہے۔ پس نبوت کا منصب ایسا نہیں کہ ایک انسان تھا جو افسر لئے بنا دیا گیا حتی کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی اس کی طرح افسر اسے بنا دیا جا سکتا تھا۔ بلکہ دراصل نبوت ایک پیدائشی چیز ہے، اور نبی کی حیثیت ذاتی ہی اس کی حیثیت نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اس کی حیثیت نبوی بالقوہ ہوتی ہے، اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی

ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پھل کہ وہ بالذات میٹھا پھل ہی ہے لیکن اس کی مٹھاس پختگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ظاہر ہوتی ہے۔

اب ان آیات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور ذات نبوی کے حق میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ میں توضیح مدعا کے لیے ان آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے نقل کرتا ہوں۔

(۱) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (۳ : ۱۸)
اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر اطلاع بخشے بلکہ وہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

(۲) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ : ۹)۔
اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

(۳) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴ : ۱۱)
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

(۴) وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳ : ۱)
تارے کی قسم جب وہ ٹوٹتا ہے، تمہارا صاحب (یعنی نبی) نہ گم کردہ راہ ہے اور نہ کج راہ ہے، اور نہ وہ ہوائے نفس سے بولتا ہے۔ وہ صرف وحی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔

(۵) اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ (۶ : ۵)۔
میں صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔

(۶) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳)
تمہارے لیے رسول خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

(۷) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳ : ۴)۔
اے محمدؐ! کہدو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(۸) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا
مومنین کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول

اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ...... وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا ...... (۲۴ : ...)

کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ...... اور اگر تم اس کی (یعنی رسول کی) اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے۔

۹۔ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۴:

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی نہیں! وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں پھر تو جو کچھ فیصلہ کرے اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں اور سر بسر تسلیم کریں۔

۱۰۔ وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا۔ (۳۳ : ۵)

کسی مومن یا مومنہ کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے تو ان کے لیے اپنے امر میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی ہے۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

ان آیات پر غور کیجیے تو تمام حقیقت آپ پر کھل جائے گی۔

۱۔ پہلی آیت میں نبی اور عام انسانوں کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نبی پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ اپنے غیب کا علم ہر انسان پر فرداً فرداً ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے بندوں میں سے کسی خاص بندے پر ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے عام انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اس بندے پر ایمان لائیں۔

۲۔ دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے کا مدعا صرف یہی نہیں کہ اس کو رسولِ خدا مان لیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ یہ اطاعت کا حکم نہ صرف اس آیت

میں، بلکہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی دیا گیا ہے، مطلق ہے، مقید نہیں ہے۔ کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں بتایا گیا کہ رسول کی اطاعت فلاں فلاں امور میں ہے اور ان امور کے سوا کسی دوسرے امر میں نہیں ہے۔ پس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسول ایک حاکم عام ہے۔ جو حکم بھی دے، مومنوں پر اس کا ماننا لازم ہے۔ یہ خود رسول کے اپنے اختیار میں ہے کہ الٰہی ہدایت کے ماتحت اپنی حکومت کے اقتدار کو مخصوص حدود کے اندر محدود کر دے، اور ان حدود سے باہر لوگوں کو رائے اور عمل کی آزادی بخش دے۔ لیکن مومنوں کو ہرگز یہ حق نہیں کہ وہ خود رسول کے اختیارات کی حدبندی کریں۔ وہ مطلقاً محکوم و مامور ہیں۔ اگر رسول ان کو زراعت اور نجاری اور حدادی وغیرہ کے طریقوں میں سے بھی کسی خاص طریقے کو اختیار کرنے کا حکم دیتا تو ان کا فرض یہی تھا کہ بے چون و چرا اس حکم کی اطاعت کرتے۔

۳۔ جب اطاعت کا غیر مشروط اور غیر محدود حکم دیدیا گیا تو یہ بھی اطمینان دلانا ضروری تھا کہ نبی کی اطاعت، اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت نہیں ہے (جیسا کہ جاہل کفار کا خیال تھا، جو کہتے تھے کہ هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۲۱:۱) کیا یہ نبی نہیں جیسا ایک بشر نہیں ہے؟ اور مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (۲۳:۲)۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر تمہارے ہی جیسا ایک بشر اور اس پر چاہتا یہ ہے کہ تم پر فضیلت حاصل کرے۔ اور وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۲۳:۳) اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے)، دراصل یہ خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ نبی جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے اور جو کچھ عمل کرتا ہے خدا کی ہدایت کے ماتحت کرتا ہے۔ وہ خود اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتا، بلکہ خدا کی وحی کا اتباع کرتا ہے، اس لئے تم کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اس کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے یہی بات تیسری، چوتھی، اور پانچویں آیت میں بیان کی گئی ہے۔

ان آیات میں جس چیز کو وحی کہا گیا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد کتاب اللہ ہے، اور کتاب کے سوا کوئی

وحی نبی پر نازل نہیں ہوتی لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ انبیا علیہم السلام پر صرف کتاب ہی نازل نہیں کی جاتی، بلکہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ وحی نازل کرتا رہتا ہے اور اُسی وحی کی روشنی میں وہ سیدھی راہ چلتے ہیں، معاملات میں صائب رائے قائم کرتے ہیں، اور صحیح تدبیر عمل میں لاتے ہیں۔ نوح علیہ السلام کو دیکھیے۔ طوفان کی پیش بندی کے لیے اللہ کی نگرانی میں اور اس کی وحی کے ماتحت کشتی بناتے ہیں۔ (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا ۱۱: ۴) حضرت ابراہیم کو ملکوت سماوات وارض کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے، اور مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت دکھائی جاتی ہے۔ حضرت یوسف کو خوابوں کی تعبیر بتائی جاتی ہے (ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۱۲: ۵)۔ حضرت موسیٰ سے طور پر باتیں کی جاتی ہیں، پوچھا جاتا ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے اس سے بکریاں چراتا ہوں، حکم ہوتا ہے اس کو پھینک دو، جب لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے اور حضرت موسیٰ ڈر کر بھاگتے ہیں تو فرمایا جاتا ہے۔ يَا مُوسَىٰ أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ (۲۸: ۴)۔ پھر حکم دیا جاتا ہے کہ اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ۔ وہ اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السلام کو مانگتے ہیں اور یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ دونوں بھائی فرعون کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ (۲۰: ۲)۔ فرعون کے دربار میں سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ ڈرتے ہیں تو وحی آتی ہے لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ (۲۰: ۴) جب فرعون پر اتمام حجت ہو چکتا ہے تو ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ أَسْرِ بِعِبَادِي إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ (۲۶: ۴)۔ دریا پر پہنچتے ہیں تو فرمان آتا ہے اِضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶: ۴) کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایتِ عام کے لیے نازل ہوئی ہو؟ یہ مثالیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ تعالیٰ ہمیشہ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری فکر و رائے کے غلطی کرنے کا امکان ہو، اپنی وحی سے ان کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ اور یہ وحی اس وحی سے ماسویٰ ہوتی ہے جو ہدایت عام کے لیے اُن کے واسطے سے بھیجی جاتی

اور کتاب میں درج کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک الہٰی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام دے۔

ایسی ہی وحی غیر متلو اور وحی خفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی تھی جس کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ حضور انور نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا۔ اس کے متعلق کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں آیا مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت اللہ الحرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا اس وقت ارشاد ہوا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (۲: ۱۴۳)

جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسول کا اتباع کرنے والے اور اتباع سے منہ موڑنے والے کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس کو وحی الٰہی سے قبلہ بنایا گیا تھا۔ جنگ احد کے موقع پر حضور نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضور کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ (۳: ۱۲۶)

اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا۔

ظاہر ہوا کہ یہ وعدہ اللہ کی طرف سے تھا۔ جنگ احد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر ثانیہ کے لیے لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا۔ یہ حکم قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ بھی اسی کی جانب سے تھا۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳: ۱۷۲)۔

جن لوگوں نے لڑائی میں زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا۔

جنگ بدر کے موقع پر حضور کے مدینے سے نکلنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ (۸: ۵)

جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے نکالا۔

گھر سے نکلنے کا حکم قرآن میں نہیں آیا۔ مگر بعد میں اللہ نے تصدیق فرمائی کہ یہ خروج اس کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی رائے سے۔ اس سے پہلے حضورؐ کو خواب میں جنگ کا نقشہ دکھا دیا گیا تھا جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۱۷:۶)۔ — ہم نے جو خواب تم کو دکھایا تھا اس کو لوگوں کے لیے ہم نے محض ایک فتنہ بنا دیا۔

پھر عین جنگ کے موقع پر اللہ نے اپنے نبی کو خواب دکھایا:۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا (۸:۵) — جب کہ اللہ ان کو قلیل بنا کر تیرے خواب میں تجھے دکھا رہا تھا

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم صدقات پر ناک بھوں چڑھائی تو اللہ نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا کہ یہ تقسیم خود حضرت حق کے ارشاد سے عمل میں آئی تھی:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ (۹:۷)۔ — اگر وہ راضی ہو جاتے اس حصہ پر جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر تمام صحابہ صلح کے مخالف تھے، اور صلح کی شرائط ہر شخص کو ناقابل قبول نظر آتی تھیں مگر اللہ کے نبی نے ان کو قبول کیا، اور اللہ نے بعد میں تصدیق کی کہ یہ صلح اسی کی جانب سے تھی

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸:۱)۔ — ہم نے تجھکو فتح مبین عطا کی۔

آیات کے تتبع سے اس قسم کی اور بہت سی مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ مگر یہاں استقصار مقصود نہیں ہے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ کا تعلق اپنے انبیاء سے کوئی عارضی اور وقتی تعلق نہیں ہے کہ جب کبھی اس کو اپنے بندوں تک کوئی پیغام پہنچانا ہو بس اسی وقت یہ تعلق بھی قائم ہو اور اس کے بعد منقطع ہو جائے بلکہ دراصل حق تعالیٰ جس شخص کو پیغمبری کیلئے منتخب فرماتے ہیں اس کی طرف وہ ہمیشہ ایک توجہ خاص کیساتھ متوجہ رہتے ہیں اور دائماً اپنی وحی سے اس کی ہدایت و رہنمائی فرماتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر گامزن رہے اور اس سے کوئی ایسا قول یا فعل صادر

نہ ہونے پائے جو مرضات الٰہی کے خلاف ہو۔ سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے، اور جیسا کہ میں اس مضمون کے پہلے حصہ میں عرض کر چکا ہوں، یہ بات بھی قرآن نے کھول کر بیان کر دی ہے کہ انبیاء پر ہمیشہ اللہ کی نگرانی رہتی ہے، ان کو غلط روی سے محفوظ رکھا جاتا ہے، اور اگر مقتضائے بشریت ان سے کبھی کوئی لغزش ہوتی ہے، یا وہ وحی خفی کے لطیف اشارے کو سمجھنے میں کبھی غلطی کرتے ہیں، یا اپنے اجتہاد سے کوئی ایسی روش اختیار کرتے ہیں جو مرضات الٰہی سے یک سر موہٹی ہوئی ہو، تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کرتا ہے، اور تنبیہ کر کے سیدھے رستے پر لے آتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام کی لغزشوں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے، اس کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ لوگوں کے دلوں سے انبیاء علیہم السلام کا اعتماد اٹھ جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ جب انبیاء بھی انہیں کی طرح نعوذ باللہ غلط کار ہیں تو ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ہوائے نفس کا اتباع کرنے یا اپنی رائے اور بشری اجتہاد پر چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ چونکہ اس کی طرف سے اس کے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں، اس لیے اس نے ان پر یہ پابندی عائد کر دی ہے کہ وہ دائماً اس کی ہدایت پر کاربند رہیں، اور اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی رضا کے خلاف عمل نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی باتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کی گئی ہے جو عام انسانی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مثلاً کسی انسان کا شہد کھانا یا نہ کھانا، اور کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے دخل در معقولات پر چیں بجبیں ہونا، یا کسی کے لیے دعائے مغفرت کرنا کونسا ایسا اہم واقعہ تھا۔ مگر اللہ نے اپنے نبی کو ایسے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی رائے یا دوسروں کی مرضی پر چلنے نہ دیا۔ اسی طرح جنگ کی شرکت سے کسی کو معاف کر دینا، اور بعض قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا ایک امیر کی زندگی میں محض ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر نبی کی زندگی میں یہی واقعہ اتنا اہم بن جاتا ہے کہ اس پر تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ اللہ کے نبی کی حیثیت عام امراء کی سی نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہو بلکہ منصب نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبی کے لیے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک ٹھیک وحی الٰہی کے مطابق ہو اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی خفی کے اشارے کو نہ سمجھ کر مرضی الٰہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرے تو اللہ تعالیٰ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

۴۔ اللہ نے اپنے نبی کی اس خصوصیت کو ہمارے سامنے اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ ہم کو اس کے نبی کی راست روی پر کامل اعتماد ہو، اور ہم پورے وثوق کے ساتھ یقین رکھیں کہ نبی کا قول اور عمل گمراہی اور کج راہی اور اتباع ہوا اور بشری فکر و رائے کی غلطیوں سے قطعاً محفوظ ہے اور زندگی میں اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ اس صراط مستقیم پر جما ہوا ہے جو ٹھیک ٹھیک خدا کی بتائی ہوئی ہے۔ اور اس کی سیرت پاک اسلامی سیرت کا ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں ہے، اور اللہ نے خاص طور پر اس کامل واکمل نمونہ کو اسی لیے بنایا ہے کہ اس کے بندوں میں سے جو کوئی اس کا مقبول و محبوب بندہ بننا چاہے وہ آنکھ بند کر کے اسی نمونہ کی پیروی کرے۔ اس مقصد کو چھٹی اور ساتویں آیت میں کھول دیا گیا ہے چھٹی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ میں ایک اُسوۂ حسنہ ہے، اور ساتویں آیت میں رسول اللہ کے اتباع کو محبوب الٰہی بننے کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے۔ یہاں پھر ہم کو کسی قسم کی تخصیص و تحدید نظر نہیں آتی صریح تعمیم و اطلاق ہے، رسول اللہ کی ذات کو مطلقاً اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے، اور مطلقاً آپ کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس قدر زیادہ آپ کا اتباع کروگے، اور اپنی زندگی میں سیرت پاک کا رنگ جتنا زیادہ پیدا کروگے، اتنا ہی تقرب تم کو بارگاہ الٰہی میں حاصل ہوگا، اور حق تعالیٰ اتنا ہی تم کو پیار کرے گا۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اتباع کا عام حکم دینے سے یہ مراد نہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا اور جس طرح کیا، لوگ بھی بعینہ وہی فعل اسی طرح کریں، اور اپنی زندگی میں آپ کی حیات طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے،

نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں مجملاً میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور براہ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضور کے اسوۂ کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی مطابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کرکے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے مثلاً تمدنی، معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضور نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، بعض ایسی ہیں جن میں حضور نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، اور بعض ایسی ہیں جن میں حضور کے طرز عمل سے ہم کو مکارم اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ روح اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضور کا اتباع کرنا چاہے، اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے، تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا چاہیے، اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کرکے قوانین وضع کرنے چاہئیں، اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت نزاع پسند واقع ہوئی ہے وہ اس میں طرح طرح کی حجتیں نکالتے ہیں کہتے ہیں کہ رسول اللہ عربی بولتے تھے تو کیا ہم بھی عربی بولیں؟ آپ نے عرب عورتوں سے شادیاں کیں تو کیا ہم بھی عربوں ہی میں شادیاں کریں؟ آپ ایک خاص وضع کا لباس پہنتے تھے تو کیا ہم بھی ویسا ہی لباس پہنیں؟ آپ ایک خاص قسم کی غذا کھاتے تھے تو کیا ہم بھی وہی غذا کھائیں؟ آپ کی معاشرت کا ایک خاص طریقہ تھا تو کیا ہم بھی بعینہٖ وہی معاشرت اختیار کریں؟ کاش یہ لوگ غور کرتے کہ اصل چیز وہ زبان نہیں جو آپ بولتے تھے بلکہ وہ اخلاقی حدود ہیں جن کی پابندی کو حضور نے گفتگو

میں ملحوظ رکھا۔ اصل چیز یہ نہیں کہ شادی عرب عورت سے کی جائے یا غیر عرب سے، بلکہ یہ ہے کہ جس عورت سے بھی کی جائے اس کے ساتھ ہمارا معاملہ کیسا ہو؟ اس کے حقوق ہم کس طرح ادا کریں؟ اور اپنے جائز شرعی اختیارات کو اس پر کس طرح استعمال کریں؟ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ تھا اس سے بہتر نمونہ ایک مسلمان کی خانگی زندگی کے لیے دوسرا کونسا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کس نے کہا کہ آپ جس وضع کا لباس پہنتے تھے وہی مشروع لباس ہے۔ اور جو کھانا آپ کھاتے تھے بعینہ وہی کھانا ہر مسلمان کو کھانا چاہیے۔ اصل میں اتباع کے قابل جو چیز ہے وہ تو تقویٰ اور پاکیزگی کے وہ حدود ہیں جو آپ اپنے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں ملحوظ رکھتے تھے۔ انہی حدود سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ رہبانیت اور نفس پرستی کے درمیان جس معتدل روش کا ہم کو قرآن میں ایک مجمل سبق دیا گیا ہے اس پر ہم کس طرح عمل کریں کہ نہ تو طیبات سے ناروا اجتناب ہو اور نہ اسراف۔ یہی حال حضور کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے دوسرے تمام معاملات کا بھی ہے، وہ آپ کی زندگی پوری کی پوری ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کی زندگی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عائشہؓ نے سچ فرمایا کہ کَانَ خُلُقُہُ القُرآن۔ اگر تم کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن کی تعلیم اور اسپرٹ کے مطابق ایک مومن انسان کو دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے، تو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھو۔ جو اسلام خدا کی کتاب میں مجمل ہے وہی رسول خدا کی ذات میں تم کو مفصل نظر آئے گا۔

الحمدللہ کہ ہمارے دوست چوہدری غلام احمد صاحب ان لوگوں کے ہم خیال نہیں ہیں مگر بعض احادیث سے ان کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ "حضور ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بحیثیت رسول ہی نہیں ہوتا تھا"۔ یہ غلط فہمی جن روایات سے پیدا ہوئی ہے وہ دراصل ایک دوسری حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول ہی تھے، اور یہ شان رسالت ہی تھی کہ آپ ہمیشہ اُس مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے جس کے لیے

آپ کو بھیجا گیا تھا۔ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ لوگوں سے رائے اور عمل کی آزادی قطعاً سلب کر لیں اور ان کی عقل و فکر کو معطّل کر دیں۔ نہ آپ دنیا کو زراعت اور صنعت و حرفت سکھانے آئے تھے۔ نہ آپ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کے کاروبار اور ان کے ذاتی معاملات میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔ آپ کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا، اور وہ اسلام کو عقیدہ کی حیثیت سے دلوں میں بٹھانا اور عمل کی حیثیت سے افراد کی سیرت اور سوسائیٹی کے نظام میں نافذ کر دینا تھا۔ اس مقصد کے سوا کسی چیز کی طرف حضور نے کبھی توجہ نہیں فرمائی، اور اگر شاذ و نادر کسی موقع پر کچھ فرمایا بھی تو صاف کہدیا کہ تم اپنی رائے اور عمل میں آزاد ہو، جس طرح چاہو کرو۔ انتم اَعْلَم بامورِ دنیاکُم۔ اگرچہ صحابۂ کرام آپ کے ہر ارشاد کو رسول کا ارشاد سمجھ کر بدل و جان اس کی اطاعت پر آمادہ تھے، اور آپ کو مطلقاً مطاع و متبوع سمجھتے تھے، اور اسی لیے جب کبھی حضور کسی دنیوی مسئلہ میں کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہ کو شبہ گذرتا تھا کہ شاید یہ حکم رسالت ہو، لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ آپ نے کسی ایسے مسئلہ میں جو آپ کے مقصد بعثت سے متعلق نہ تھا، صحابہ کو کوئی حکم دیا ہو اور انہیں اطاعت پر مجبور کیا ہو۔ ۲۳ سال کی طویل مدت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مشن سے غافل نہ ہونا، اور ہر آن اس باریک فرق کو ملحوظ رکھنا کہ کونسا امر اس مشن سے تعلق رکھتا ہے اور کونسا نہیں رکھتا، اور اپنے متبعین پر کامل اقتدار رکھنے کے باوجود کبھی ان کو کسی غیر متعلق امر میں حکم نہ دینا، خود اس بات پر شاہد ہے کہ شانِ رسالت کسی وقت بھی حضور سے منفک نہ ہوتی تھی۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیوی معاملات میں جو کچھ حضور نے فرمایا وہ خدا کی وحی سے نہ تھا۔ اگرچہ آپ کے ایسے ارشادات آپ کے احکام نہیں ہیں، نہ آپ نے ان کو حکم کے انداز میں فرمایا، اور نہ کسی نے ان کو حکم سمجھا، مگر پھر بھی جو بات آپ کی زبان مبارک سے نکلی وہ سراسر حق تھی، اور غلطی کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ مثال کے طور پر طب نبوی کے باب میں جو کچھ آپ سے ثابت ہے وہ ایسی حکیمانہ باتوں سے لبریز ہے جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کا اُمّی جو طبیب نہ تھا جس نے کبھی فن طب

کی تحقیق نہ کی تھی، وہ کس طرح اس فن کی ایسی حقیقتوں تک پہنچا جو صدیوں کے تجربات کے بعد اب منکشف ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہم کو حضور کے حکیمانہ ارشادات میں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں بلحاظ آپ کے تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، مگر اللہ اپنے رسولوں کی جبلت میں جو غیر معمولی قوتیں ودیعت فرماتا ہے وہ صرف تبلیغ رسالت ہی کے کام نہیں آتیں، بلکہ ہر معاملہ میں اپنی شان امتیاز دکھا کر رہتی ہیں۔ حدادی اور زرہ سازی کا تبلیغ رسالت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ مگر حضرت داؤد اس میں غیر معمولی کمال دکھاتے ہیں اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ فن ہم نے ان کو سکھایا تھا۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ (۲۱: ۶)۔ پرندوں کی بولیاں جاننے سے تبلیغ رسالت کو کیا واسطہ؟ مگر حضرت سلیمان اس میں کمال ظاہر فرماتے ہیں اور خود کہتے ہیں کہ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷: ۲) نجاری اور کشتی سازی تبلیغ رسالت کا کونسا شعبہ ہے؟ مگر اللہ تعالیٰ حضرت نوح سے یہ نہیں کہتا کہ ایک مضبوط سی کشتی بنوا لو بلکہ فرماتا ہے وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۱۱/۴)

پس انبیاء کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی امور وحی کیے گئے جو براہ راست تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع ہے۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم چلنا مسلمان ہونے کے لیے ناگزیر شرط ہے، اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں، مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور بارگاہ حق میں تقرب کا طلبگار ہو، اس کے لیے بغیر اس کے چارہ نہیں کہ ٹھیک ٹھیک نبی کی سنت پر چلے، حتیٰ کہ اگر ایک سر مو بھی اس خط مستقیم سے ہٹے گا تو تقرب اور محبوبیت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی۔ اس لیے کہ محبوبیت کے لیے بجز اتباع نبی کے اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

۵۔ اس بحث کے بعد یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کی امارت اور دوسرے امیروں

کی امارت میں کیا فرق ہے، اور نبی کے فیصلے اور دوسرے قاضیوں کے فیصلے میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہے۔ تاہم میں نے تین آیتیں ایسی نقل کی ہیں جن سے یہ فرق قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے حکم پر سر جھکا دینا اور آپ کے فیصلہ کو تسلیم کرنا ایمان کے لیے ضروری شرط ہے۔ جو اس سے انکار کرے وہ مومن ہی نہیں۔ کیا یہ بات کسی دوسرے امیر یا قاضی کو حاصل ہے؟ اگر نہیں تو یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ "اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے" مجھے مولنا جیراجپوری کے اسی قول پر اعتراض ہے اور میں اس کو قرآن مجید کی تعلیم کے قطعی خلاف سمجھتا ہوں۔ رہا وہ مسئلہ جو حد درجہ ہی صاحب نے پیش فرمایا ہے تو وہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے اور اس میں مجھے ان سے بالکل اتفاق ہے۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلعم کے بعد اولی الامر کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے، اور اولی الامر اسلامی حکومت کے وہ تمام فرائض انجام دیں گے جو رسول اکرم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیتے تھے، اور معاملات میں اولی الامر کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی دانست میں ان کے فیصلہ کو حکم خدا و رسول کے خلاف بھی سمجھتا ہو تب بھی ایک حد خاص تک اس کے لیے لازم ہوگا کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے ان کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہو سکتے کہ امارت بعینہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اللہ اور رسول کہا گیا ہے، اور امارت کے احکام ہو بہو وہی ہیں جو اللہ اور رسول کے احکام ہیں۔ اگر ایسا ہو تو امرا کے بگڑ جانے اور ارباب حل و عقد کے کتاب و سنت سے منحرف ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے کوئی چارہ ان کی اطاعت کرنے اور ہلاکت کے راستوں میں ان کی پیروی کرنے کے سوا باقی ہی نہ رہے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بندۂ خدا اٹھے اور امرا کو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کرے تو مولنا اسلم کے فتوے کی رو سے تو امرا اس کو باغی قرار دے کر قتل کر دینے میں بالکل حق بجانب قرار پائیں گے اور ان کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ اللہ اور رسول تو ہم ہی ہیں، دوسرا کون ہے جس کی طرف تو ہم کو پھیرنا چاہتا ہے!

تقریظ و انتقاد

امہات الامہ

شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی یہ وہ مشہور کتاب ہے جس نے اب سے کئی سال پہلے ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ علمائے اسلام نے اس پر اتنا سخت احتجاج کیا کہ آخر کار اس کو جلا دینا پڑا۔ اس وقت سے یہ کتاب ناپید تھی اب مرحوم کے لائق پوتے جناب شاہد احمد صاحب ایڈیٹر رسالہ "ساقی" نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

مولف مرحوم کے متعلق ہم کو یہ معلوم ہے کہ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور وسیع النظر عالم تھے ان کی تالیفات ان دونوں باتوں پر گواہ ہیں۔ ان کی نیک نیتی بھی اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سے دشمنوں کے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کی اور خود مسلمانوں میں جو لوگ اسلامی تعلیمات میں شکوک رکھتے تھے ان کو مطمئن کرنے کے لیے بارہا اپنی قوت تحریر و تقریر کو استعمال کیا۔ امہات الامہ بھی انھوں نے اسی نیت سے لکھی تھی کہ دشمنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور تعدد ازواج پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کو رفع کریں۔ پس جہاں تک ان کی نیت کا تعلق ہے اس پر کسی قسم کا شبہہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ ان کے حق میں یہ بدگمانی کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ انھوں نے قصداً حملہ کرنے کی نیت سے اسلام کی مقدس ترین شخصیتوں میں سے کسی پر حملہ کیا ہوگا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس میں سخت غلطیاں کیں اور حد اعتدال سے اس قدر تجاوز کر گئے کہ بعض اوقات ان کے حسن نیت

کی رعایت ان کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کر کے ہم صرف اس حصے پر نظر ڈالیں گے جس میں مؤلف نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سیرت بیان کرتے ہوئے ضمناً خلافت کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے مسئلہ میں جو اختلاف برپا ہوا اور جس کی وجہ سے آخر کار مسلمانوں میں دو فرقے پیدا ہو گئے، اس کی بنیاد مولوی نذیر احمد صاحب کے نزدیک وہ "منافست" ہے جو آنحضرت کے حین حیات ہی سے حضرت فاطمہ رض اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے درمیان قائم تھی (ص ۹۶)۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت فاطمہ رض کو اپنی والدۂ ماجدہ کی خدمات پر جو ناز تھا اس کی وجہ سے وہ حضرت عائشہ رض کو اپنا ہمسر نہ گردانتی تھیں۔ دوسری طرف حضرت عائشہ رض کو اپنے والد ماجد حضرت ابو بکر رض کی ان خدمات پر ناز تھا جن پر خود حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے علی رؤس الاشہاد اظہار ممنونیت فرمایا۔ اس بنا پر فاضل مؤلف نے پہلا نظریہ قائم فرمایا کہ

"دونوں میں منافست کے اسباب موجود تھے، اور منافست تھی بھی۔"

اس کے بعد وہ خلافت کے "دو بڑے امیدواروں" یعنی حضرت ابو بکر رض اور حضرت علی رض کی طرف بڑھتے ہیں، اور یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ دونوں بھی اپنی اسلامی خدمات اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قریبی تعلق کی بنا پر خلافت کے مدعی تھے، اور ان دونوں میں پہلے سے "نہفتہ رقابت" اور "دلی کدورت" تھی۔ کدورت کے ثبوت میں مؤلف نے واقعہ افک کو پیش کیا ہے جس میں حضرت علی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ "خدا نے آپ پر بیویوں کے معاملہ میں تنگی نہیں کی ہے" مصنف کی رائے میں حضرت علی کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلعم حضرت عائشہ کو طلاق دیدیں، اور یہ مشورہ حضرت علی نے اُس دشمنی کی بنا پر دیا تھا جو ان کو حضرت ابو بکر رض سے تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ نے دونوں بزرگوں میں منافست کو ترقی دیکر محاسدہ کی حد تک پہنچا دیا۔

اس کے بعد جناب مولف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس خیال کا اظہار فرماتے ہیں کہ :-

"خود پیغمبر صاحب کو بھی مشکل در پیش تھی۔ انہوں نے بھی خلافت کے بارے میں کبھی صاف طور پر دو ٹوک بات نہ فرمائی، جیسی توحید کے بارے میں لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ ہاں ضرورت پڑے پر ہتہ پڑھانے کو مختلف حیثیت سے ہر ایک کے استحقاق کا اعتراف کرتے رہے"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خلافت کا تصفیہ کر دینا ضروری تھا، مگر امت کی اس ضرورت کو پورا کرنے سے جس چیز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا، وہ صرف یہ بات تھی کہ ایک طرف بیٹی کی محبت تھی اور دوسری طرف بیوی کی محبت۔ یہ ایک کھلی ہوئی اخلاقی کمزوری ہے جس کو مولف نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں مولف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے واقعۂ قرطاس کو اس انداز سے بیان کیا ہے :-

"سب سے پہلے واقعۂ قرطاس نے بھانڈا پھوڑا کہ اول دن سے رکا دلوں کی کھچڑی خلافت کے لیے پک رہی تھی۔ خلافت کے سوائے اور کون سا ایسا ضروری مطلب ہوسکتا تھا جس کے لیے احتضار کی حالت میں صورت سوال بن کر پیغمبر صاحب کو وصیت کی تکلیف دی جائے۔ بات پھر بھی گول مول رہی علیؓ نے سامنے جا کھڑے ہونے کے سوائے منہ سے کچھ نہ کہا پیغمبر صاحب نے بھی اس وصیت کی جس کے لیے کاغذ منگواتے تھے کچھ صراحت نہ فرمائی کہ کیا لکھوانا چاہتے تھے مگر جن کے دل میں منائے خلافت چٹکیاں لے رہی تھی انہوں نے تو دھینگا مشتی سے منصوبے ہی کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزاحمت کی تاویل یہ کی کہ ہماری ہدایت کے لیے قرآن بس کرتا ہے" (ص ۱۰۰)۔

اس فقرے میں حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ دونوں پر جو حملہ کیا گیا ہے وہ اتنا صریح ہے کہ اس کو کسی تاویل سے نہیں چھپایا جا سکتا۔

اس کے بعد اہل بیت کرام پر حملہ کیا گیا ہے کہ :-

"انہوں نے رزق مقسوم پر قناعت نہ کر کے گوشۂ عافیت سے پاؤں باہر نکالے اور خواہ مخواہ دعوئے خلافت کر بیٹھے .... ان کا حال کیا تھا کہ ان میں سے جب کسی کے پاس ہزار پانسو آدمیوں کی جمعیت فراہم ہوئی لگا سلطنت کے خواب دیکھنے۔ ملک گیری کی ہوس میں علم خلافت اونچا کیا، خلیفۂ وقت پر خروج کر کے ساتھیوں کو ناحق مروا دیا اور آخر کار خود بھی لڑائی میں مارڈالا گیا یا پکڑا آیا، قید کیا گیا یا زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ... اسلام کے حق میں یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ پیغمبر صاحب کی اولاد ذکور ان کے بعد زندہ نہ رہی۔ بیٹیوں میں ایک بیٹی زندہ رہی تو ان کی نسل کی بدولت اسلام میں یہ تفرقہ پڑا کہ مسلمان سنی اور شیعہ دو فریق ہو گئے جن میں ہمیشہ جوتیوں میں دال بٹتی رہتی ہے۔ بیٹا زندہ رہتا تو شاید پسر نوح ثابت ہوتا۔" (ص ۱۰۲)۔

اس فقرے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے لے کر آخر تک اہل بیت میں سے جس کسی نے خلافت کا دعویٰ کیا اس کے پیش نظر محض سلطنت کی ہوس تھی اور کسی بلند تر مقصد کا شائبہ تک نہ تھا۔ ادب اور بزرگداشت کو جانے دیجئے۔ تاریخ ہی کے اعتبار سے کیا یہ درست ہے؟ پھر قیاس آرائی کی حد یہ ہے کہ جناب مؤلف فرض کر لیتے ہیں کہ اگر آنحضرت کا بیٹا زندہ رہتا تو شاید پسر نوح ثابت ہوتا۔" قطع نظر اس کے کہ اہل بیت کے حق میں یہ انداز بیان حد درجہ گستاخانہ اور خلاف حقیقت ہے ہم پوچھتے ہیں کہ آنحضرت کے متوفی بیٹے کے حق میں جو قیاس انہوں نے قائم کیا ہے اس کے لیے مجرد بدگمانی کے سوا اور کیا بنیاد ہو سکتی ہے۔

اہل بیت اور بنو امیہ و بنو عباس کے درمیان جو خونریزیاں ہوئیں ان کو بیان کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:۔

"وہ عورتوں کی ضد نے (اور ضد بھی کھانے کی نہیں کپڑے کی نہیں خرچ پات کی نہیں سلوک مدارات کی نہیں خیالی برتری کی) کیا طول پکڑا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس ہونے کو آئے اور یہ جھگڑا طے نہ ہوا" (ص ۱۰۶)۔

پھر اس سلسلہ میں حضرت فاطمہؓ کے دعوائے فدک اور اس کے فیصلہ پر ان کے ناراض ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"کس بلا کا غصہ ہے، خدا کی پناہ۔ ادھر فاطمہ ایک سیر کی تھیں کہ مرتے مرگئیں اور اپنی آن نہ چھوڑی تو ادھر عائشہ سوا سیر کی کہ فاطمہ جواں مرگ مرگئی تھیں۔ علی کا سارا گھمنڈ فاطمہ کے مرنے سے کرکرا ہوگیا تھا اور ہارے درجہ پس خورد خلافت ان کو نصیب ہوا تھا وہ بھی ادھورا کہ عراق اور شام کے لوگ علی کی خلافت سے راضی نہ تھے پھر بھی عائشہ علی کو نیچا دکھانے کی تاک میں تھیں، علی مسند خلافت پر جم کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قاتلان عثمان کا قصاص لینے کی غرض سے علی پر فوج کشی کر بیٹھیں گویا علی نے عثمان کو قتل کیا یا کرایا ہے ہمارے ملک میں عورتوں کا ایک طبعی خاصہ ٹریاہٹ اور ایک تریا چرتر بھی مانا گیا ہے تو وہی بات ہم فاطمہ اور عائشہ میں پاتے ہیں فاطمہ تو انتقال فرماگئیں اور ان کی ہٹ بھی تم نے دیکھ لی۔ اب رہ گئیں عائشہ تو ان کا ایک چرتر تو یہ تھا....."

اس کے بعد نعوذ باللہ حضرت عائشہؓ کے "چرتر گنائے ہیں" اور اپنے دعوے کی تائید میں جو ثبوت پیش کیا ہے وہ اس قدر لغو ہے کہ اس پر بحث کرنا بالکل لاحاصل معلوم ہوتا ہے۔

آگے چل کر حضرت عثمان پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ان کے حق میں مولانا کا فتویٰ یہ ہے کہ:

"عثمان اپنی بے جا اور مجملانہ اور خودسرانہ کارروائیوں کی وجہ سے قتل کے تو نہیں عزل کے مستوجب ضرور تھے"

ہم نے ان تمام ناشائستہ فقروں کو دلی کراہت کے باوجود صرف اس لیے نقل کیا ہے کہ کوئی شخص ہم کو مولوی نذیر احمد صاحب کے حق میں بے انصافی کا الزام نہ دے۔ خود مولوی صاحب کی تحریروں سے یہ چند نمونے پیش کرنے کے بعد ہم پوری کتاب کے متعلق اپنی رائے مختصر الفاظ میں لکھ دیتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی غلطی یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور تعدد ازدواج پر عیسائی پادریوں کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے لکھی گئی تھی ان مباحث کی قطعاً ضرورت نہ تھی جن کو مولوی صاحب نے خواہ مخواہ چھیڑ دیا ہے۔

۲۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کی سیرت اس زبان میں لکھی ہے جو مرآۃ العروس اور بنات النعش ہی کے لیے موزوں ہوسکتی تھی۔ مولف میں یہ سلیقہ نہ تھا کہ ہر موضوع کے لحاظ سے اس کے مناسب زبان اختیار کرتے۔ بزرگان دین کے احوال میں وہ زبان استعمال کرنا جو نا ولوں میں استعمال کی جاتی ہے خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی جائز نہیں، کجا کہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ان کے فقرے نظروں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہیں، اور بعض مقامات پر تو زبان کا پھوہڑپن اس قدر حد سے گذرا ہوا نظر آتا ہے کہ بے اختیار کتاب ہاتھ سے پھینک دینے کو جی چاہتا ہے۔

۳۔ مولف کی نیت نیک ہی سہی مگر انہوں نے یہ کتاب لکھ کر وہ کام کیا ہے جو ایک دشمن اسلام کو کرنا چاہیے تھا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور آپ کے سب سے زیادہ مقرب صحابیوں کا وہ کیرکٹر پیش کیا ہے جو کسی حیثیت سے بھی ادنیٰ درجہ کے نفس پرست لوگوں سے ممتاز نہیں وہی ضد نفسانیت ہوس جاہ اور اپنی ذاتی اغراض کیلئے حق و ناحق کی پروا نہ کرنا جو ہم پست ترین اخلاق کے لوگوں میں دیکھتے ہیں مولوی نذیر احمد صاحب نے اسی کو ان لوگوں کی سیرتوں میں نمایاں کر دکھایا ہے جنہوں نے خاص رسول اللہ صلعم سے اسلامی اخلاق کی تعلیم و تربیت پائی تھی اور جن کے کندھوں پر آنحضرت کے

بعد دنیا میں اسلام کو پھیلانے کا بار ڈالا گیا تھا۔ اگر یہ لوگ فی الحقیقت ویسے ہی ہوتے جیسا مولوی نذیر احمد صاحب نے ان کو سمجھا ہے تو قسم بخدا کہ اسلام ہرگز مدینہ سے چل کر دلی تک نہ پہنچتا اور نہ تیرہ صدیوں تک قائم رہتا۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی تعلیم و تربیت کے باوجود ان لوگوں کے اخلاق ایسے ہی تھے جیسے مولوی صاحب نے بیان کئے ہیں تو نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشن میں قطعاً ناکام ہوئے۔ اگر یہ لوگ عہد جاہلیت کے کسی عرب سردار کے اقربا و اصحاب ہوتے تو کیا ان سے انہی اخلاق اور افعال کا صدور نہ ہوتا جو مولوی نذیر احمد صاحب نے بیان کیے ہیں؟ پھر اخلاق کے اعتبار سے جاہلیت اور اسلام میں فرق ہی کیا باقی رہا؟ اور وہ کون سی اصلاح اخلاق ہے جس پر اسلام فخر کر سکتا ہے؟

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے صحیح اور معتبر تاریخی واقعات کو صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان پر قیاسات کی ایک بڑی عمارت تیار کی ہے، اور افسوس یہ ہے کہ ان کے تمام قیاسات ایسے ہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم مورخ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت اور اصحاب سے سخت بدگمانی رکھتا ہو، ان واقعات پر قیاس آرائی کرتا تو شائد اس سے زیادہ بدتر قیاس آرائی نہ کر سکتا۔ ہر واقعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اچھا اور ایک برا۔ دوست اچھا پہلو اختیار کرتا ہے۔ اور دشمن برا پہلو۔ بدقسمتی سے مولوی نذیر احمد صاحب نے برا پہلو اختیار کیا اور صحابہ و اہل بیت رسول کے ہر فعل میں ان کو بدنیتی اور دنائت اخلاق ہی نظر آئی۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہماری رائے میں امہات الامہ ہرگز اس قابل نہ تھی کہ اسے دوبارہ شائع کیا جاتا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کو ایک عالم اور انشاپرداز کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہے اس میں یہ کتاب کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ اس کو بٹہ لگاتی ہے۔ مرحوم سے آخری عمر میں ایک غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ مناسب تھا کہ اس پر پردہ پڑا رہنے دیا جاتا۔ ان کے پوتے نے کچھ اچھا نہ کیا کہ اپنے دادا کی غلطی کو پھر ایک مرتبہ منظر عام پر لے آئے۔

مطبوعات

صدق روزہ اخبار، زیر ادارت مولنا عبدالماجد دریا بادی۔ مقام اشاعت لکھنؤ۔ چندہ سالانہ للعہ ششماہی (عہ/)۔

یہ "سچ" کا دوسرا جنم ہے معنوی خصوصیات وہی ہیں صورت بھی وہی ہے۔ صرف نام بدلا ہوا ہے۔ مولانا عبدالماجد کے انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن کی خدمت میں مشغول ہوجانے کی وجہ سے "سچ" بند ہو گیا تھا۔ صداقت پرستوں کو اندیشہ تھا کہ "سچ" کا بند ہونا کہیں جھوٹ کے فروغ کا سبب نہ بن جائے۔ اس لیے کہ سچ جاری ہو یا بند ہو جائے مگر جھوٹ برابر اپنا کام کیے جارہا ہے۔ الحمد للہ کہ صدق کے اجرا نے اس اندیشے کو رفع کر دیا۔ جو لوگ مولنا عبد الماجد صاحب کی تحریروں کے لذت آشنا ہیں اور سچ کے مطالعہ سے فیضیاب ہو چکے ہیں ان کے لیے تو صرف یہی اطلاع کافی ہے کہ "سچ" اب "صدق" کے نام سے پھر نکل آیا ہے۔ مگر جو لوگ ابھی تک اس فیض سے محروم رہے ہیں، ان کو ہم مشورہ دیں گے کہ "صدق" کا ضرور مطالعہ کریں۔ درحقیقت یہ تمام ہندوستان میں اپنی شان کا ایک ہی اخبار ہے، اور اس کا مطالعہ جدید تعلیم یافتہ "صاحبوں" اور پرانے طرز کے "مولویوں" کے لیے یکساں مفید ہے

دی ٹرتھ ہفتہ وار۔ زیر ادارت فضل کریم خان درانی وسید محمد شاہ۔ مقام اشاعت لاہور۔ چندہ سالانہ للعہ مجلس تبلیغ القرآن، لاہور کی جانب سے یہ انگریزی اخبار حال میں جاری ہوا ہے۔ سلامت روی اور اعتدال کے ساتھ اسلامی خیالات کی اشاعت، اور مسلمانوں کے قومی مفاد کی حمایت کر رہا ہے۔ انگریزی زبان میں اس قسم کے پرچوں کی مسلمانوں کو بڑی ضرورت ہے۔ الحمد للہ کہ اب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کامیاب کوششیں شروع ہوگئی ہیں۔ جہاں اردو میں "صدق" ہے وہاں انگریزی میں "ٹرتھ" بھی ہے۔

قانون ماہوار رسالہ۔ زیر ادارت حاجی رحیم بخش صاحب وکیل و دیگر حضرات۔ مقام اشاعت لاہور۔ چندہ سالانہ (عہ)۔

مخصوص فنی پرچہ ہے جس میں قانون اور اس کے متعلقات پر مفید مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ ایک حصہ قانونی سوالات اور ان کے جوابات کے لیے مختص ہے جس سے غیر قانونی لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

الاطفال | رسالہ ہمدرد صحت دہلی کا خاص نمبر ہے جس میں دو سو صفحے کے مضامین صرف ایک موضوع پر جمع کیے گئے ہیں، یعنے بچوں کی پرورش، نگہداشت، تربیت جسمانی، حفظان صحت، اور امراض و علاج وغیرہ۔ مضمون نگاروں میں ہندوستان اور یورپ کے اچھے اچھے ڈاکٹر اور اطبا شامل ہیں۔ ادارۂ ہمدرد صحت نے یہ رسالہ شائع کر کے درحقیقت ایک مفید اور قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

قیمت قسم اعلیٰ ۱۲ آنہ، قسم ادنیٰ ۸ آنہ

تفسیر قرآن | مؤلفہ پادری جے علی بخش صاحب، لاہور۔ قیمت عہ

پادری صاحب نے اس کتاب میں قرآن مجید کی صرف مکی سورتوں کو الگ کر کے ان کو ملحاظ نزول مرتب کیا ہے، اور ان کی تفسیر لکھی ہے۔ ایک عیسائی مصنف سے ہم امید نہیں کر سکتے کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر بالکل مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے لکھے گا۔ خصوصاً جب کہ خود مسلمان مفسر آج کل قرآن کے معانی بیان کرنے میں طرح طرح کی جدتیں کر رہے ہیں، تو ایک عیسائی مفسر کی جدت طرازی کسی طرح بھی محل شکایت نہیں ہو سکتی لیکن اس بات کا ہم کو کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ پادری صاحب نے تفسیر میں جو لہجہ اور انداز بیان اختیار کیا ہے وہ بالکل ایک صاحب علم اور نیک نیت اور تحقیق پسند آدمی کے شایان شان ہے۔ ان کے پیش نظر صرف ایک مقصد ہے جس کو انہوں نے اپنی "التماس" میں ظاہر کر دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ بائبل کی روشنی میں کریں۔ اس کوشش میں جگہ جگہ ان سے لغزشیں ضرور ہوی ہیں، مگر من حیث المجموع انہوں نے کامیابی کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے قصص کی تائید میں بائبل کی تعلیمات اور اس کے قصص پیش کیے ہیں۔ مصنف ایک سچے عیسائی کی طرح وحی، الہام اور نزول کتب آسمانی کے قائل ہیں۔ اور اس کے ساتھ گو انہوں نے صاف الفاظ میں قرآن کے منزل من اللہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ....

نبی ہونے کا اقرار نہیں کیا ہے، مگر ان کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو حضور کی تصنیف نہیں سمجھتے جیسا کہ عام عیسائیوں کا خیال ہے، "ملکۂ مکاشفہ" قرار دیتے ہیں، ویسا ہی مکاشفہ جیسا انبیاء بنی اسرائیل پر ہوتا رہا ہے۔ اگر عیسائی علماء، اسی طرح کھلے دل کے ساتھ نیک نیتی سے قرآن کا مطالعہ کریں تو شاید انھیں اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی امر مانع نہ ہوگا کہ قرآن مجید تمام پچھلی کتب آسمانی کا مصدق اور مہیمن ہے، اور اسی پیغام کو باطل کی تمام آمیزشوں سے پاک کرکے پیش کر رہا ہے جسے اللہ کے نبی ہر زمانہ میں پیش کرتے آئے ہیں۔

بیان الفرقان علی علم البیان تالیف مولانا ثناء اللہ امرتسری ضخامت ۶ صفحات قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ کتب خانہ ثنائیہ امرتسر۔

مولانا ثناء اللہ صاحب اس سے پہلے تفسیر القرآن بالقرآن کے طریق پر ایک تفسیر عربی زبان میں اور متکلمین کے طریقہ پر ایک تفسیر اردو میں لکھ چکے ہیں۔ اب یہ تفسیر انہوں نے علوم لغت و ادب کے لحاظ سے عربی میں لکھنی شروع کی ہے جس کا پہلا جز ہمارے پاس تبصرہ کے لیے آیا ہے۔ اس جزء میں صرف سورہ فاتحہ اور سورۂ بقر کی تفسیر ہے۔ زبان میں کہیں کہیں ہندیت نمایاں ہوگئی ہے۔ مگر فی الجملہ یہ ایک مفید کام ہے جو مولانا نے شروع کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس کتاب کو وہ اردو میں لکھتے۔

تقریر سیرت از جناب مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت علماء ہند ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۲؍ دفتر الجمعیت، بلی ماران دہلی سے مل سکتی ہے۔

مولانا احمد سعید صاحب ہندوستان کے ان چند منتخب لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خطابت کی غیر معمولی قوت عطا کی ہے جس کسی کو ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان کی قدرت کلام روانی تقریر وسعت اطلاع سلاست بیان و شیرینی زبان پر انگشت بدندان رہ گئے ہیں۔ یہ انہی کی ایک تقریر ہے جس کو قلم بند کرکے کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے اگرچہ تقریر کا اصلی لطف سننے ہی میں ہے پڑھنے میں وہ لطف نہیں آسکتا لیکن پھر بھی پڑھنے والوں کو اس تقریر میں بظاہر مختصر سیرۃ النبی کے موضوع پر

تاریخ فلسفہ تفسیر حدیث، تصوف، علم کلام، اور ادب پر ایسے ایسے عجیب اور دلچسپ مباحث یکجا ہو گئے جو شاید کہیں یکجا نہ مل سکیں جگہ جگہ سیاسیات حاضرہ پر جو تبصرے کیے گئے ہیں، اور دور جدید کے روشن خیالوں کو خطاب کر کے جو بحثیں کی گئی ہیں، وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔

انساب و قبائل کا باہمی امتیاز و تفاضل | تالیف مولنا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند قیمت ۲؎ مطبع قاسمی دیوبند۔

اس رسالہ میں آیۂ کریمہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ کی تفسیر بیان کی گئی ہے فاضل مفسر نے آیت کو تین اجزاء پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا جزء وانثیٰ پر ختم ہوتا ہے، اور پیدائش کے اعتبار سے تمام انسانوں میں خلقی و نوعی مساوات ثابت کرتا ہے جس سے قانونی و شرعی مساوات بھی لازم آتی ہے۔ کیونکہ جب انسان اور انسان میں نوعیت اور خلقت کے اعتبار سے کوئی فرق و امتیاز نہیں، تو ایسے قوانین اور اصولی و اجتماعی امور میں بھی کسی قسم کا فرق و امتیاز نہ ہونا چاہیے جو انسان کے لیے من حیث الانسان وضع کیے گئے ہیں دوسرا جزء لِتَعَارَفُوا پر تمام ہوتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ گو تمام انسان ایک ہی اصل سے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو انساب اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے اور ان میں ایسی مختلف تعریفی خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو ان کے درمیان وجہ امتیاز اور سبب تعارف ہیں اس لیے لامحالہ انساب و قبائل کا تفاضل ثابت ہوتا ہے، کیونکہ تعارف کے لیے صرف تعدد کافی نہیں بلکہ امتیاز و تفاوت بھی ضروری ہے اور امتیاز و تفاوت کے ساتھ فرق مراتب بھی ناگزیر۔ اور اور جب یہ فرق ناگزیر ہے تو نسبی خصوصیات اور خاندانی اخلاق کی حفاظت کے لیے شادی بیاہ میں کفارت کا لحاظ کرنا بھی ضرور ہونا چاہیے۔ تیسرا جزء إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نسبی امتیاز و تفاضل کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں، نہ یہ کرامت کوئی ایسی کرامت ہے جو دنیا میں تم کو قوانین کی

پابندی سے اور آخرت میں حق تعالیٰ کے محاسبہ سے مستثنیٰ کرنے والی ہو۔ اصل میں اللہ کے ہاں جس کرامت کا اعتبار ہے وہ پیدائشی اور نسبی کرامت نہیں بلکہ اختیاری اور کسبی کرامت ہے۔ جو شخص اپنے اختیار اور کسب سے فضائل حاصل کرے گا وہی اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔ فاضل مؤلف نے اس مضمون کو ایسی حجتوں کے ساتھ بیان کیا ہے جو ناقابل انکار ہیں۔ انہوں نے نہایت محکم استدلال اور غایت درجہ دلپذیر اسلوب بیان اختیار کیا ہے، اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ انساب کا فرق مراتب بجائے خود ایک حقیقت ہے اگر نہ تو اس سے اسلامی مساوات میں کوئی رخنہ پڑتا ہے اور نہ وہ تفاخر بالانساب کے لیے سرمایہ بن سکتا ہے۔

مسلمان بیبیاں | از جناب مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۶ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

لائق مولف نے یہ رسالہ خاص طور پر مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کی اخلاقی و دینی تعلیم کے لیے لکھا ہے۔ اس میں ازواج مطہرات اور صحابیات رضی اللہ عنہن کی سیرت کے بہترین نمونے جمع کیے گئے ہیں جو خدا اور رسول کی محبت، عبادت گذاری، حیا، صبر، خدا ترسی، ایثار و قربانی، حسن معاشرت، شوہر کی محبت و خدمت، اولاد کی تربیت، حق داروں کے حقوق کی رعایت، اور ایسے ہی بہت سے اخلاقی فضائل کا سبق دینے والے ہیں، زبان نہایت سلیس اور انداز بیان دلنشین ہے مسلمان بچیوں کو ایسی کتابیں ضرور پڑھائی جانی چاہئیں۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہئے۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

آباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کون سی کتابوں سے خالی ہے

اس کا جواب ان الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اس کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہراہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو اپنے کتبخانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرہ پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتب خانہ کو دیکھئے اور اس میں جو کمی ہو اس کو پورا کرنے کیلئے ہمارے کتب خانہ کو دیکھئے جہاں عربی فارسی اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی، ادبی، تاریخی، فنی، جدید و قدیم تصنیفات نہایت تلاش و جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں، اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں درسی کتابیں منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی۔ اے کلاس بزبان عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی۔ مرہٹی۔ تلگو۔ کنڑی وغیرہ نیز کنڈر گارٹن ماڈل کے متعلق نقشہ جات دیواری رنگین ہر قسم کے چارٹ اسباق الاشیاء وغیرہ مدارس اور دیگر دفاتر کے لئے نارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل واجبی قیمتوں پر حاصل کیجئے۔

سید عبدالقادر تاجر کتب

و مالک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل بکڈپو چار مینار حیدرآباد دکن